تعلیم و تربیت
جون 2014ء
جاگو جاگو ہوا سویرا
صفحہ نمبر 28
SCANNED BY PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

74 واں سال دوسرا شمارہ

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

جون 2014ء

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

کسی شہر میں ایک شخص زبان کا بہت میٹھا لیکن دل کا بہت کڑوا تھا۔ وہ صبح و شام عوام کو تکلیف پہنچانے والی باتیں سوچتا رہتا۔ ایک دفعہ اس بُری طبیعت والے انسان نے لوگوں کے راستے میں کانٹوں والی جھاڑی اُگا دی۔ کچھ ہی دنوں میں جھاڑی خاصی بڑھ گئی اور اس میں بے شمار لمبے لمبے کانٹے اُگ آئے۔ لوگ اپنے آپ کو بچانے کے لیے بڑی احتیاط سے گزرتے لیکن اس کے باوجود کوئی نہ کوئی کانٹا ان کے پاؤں کو زخمی کر دیتا۔ لوگوں نے اکثر و بیشتر اس بُری خصلت والے بندے سے کانٹوں والی جھاڑی کی شکایت کی اور کہا کہ وہ اسے اکھاڑ دے لیکن وہ مسکرا کر نہایت نرمی سے جواب دیتا کہ بہت بہتر، میں ابھی اکھاڑ ڈالتا ہوں مگر جھاڑی نہ اکھاڑتا، یہاں تک کہ جھاڑی نے لوگوں کے گزرنے کا آدھا راستہ گھیر لیا۔

لوگوں نے تنگ آ کر بادشاہ سے شکایت کی اور بادشاہ نے اس شخص کو بلا کر حکم دیا کہ وہ جلد از جلد لوگوں کی شکایت کا ازالہ کرے اور فوراً راستے سے جھاڑی کو کاٹ دے۔ وہ شخص بادشاہ سے وعدہ کر کے چلا گیا لیکن اس نے جھاڑی پھر بھی نہ اکھاڑی۔ کوئی اس کی توجہ اس طرف دلاتا تو کہتا کہ آج فرصت نہیں، کل یہ کام کر دوں گا۔ اس جھوٹی کل کا یہ نتیجہ نکلا کہ جھاڑی چند روز میں اتنی بڑھ گئی کہ اس کا ہٹانا مشکل ہو گیا اور راستہ بالکل بند ہو گیا۔

پیارے بچو! بُرائی کو دُور کرنے کے لیے سستی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یاد رہے کہ جو وقت گزرتا جائے گا اسی قدر بُرائی کی خاردار جھاڑی بڑھتی چلی جائے گی اور آپ کی طاقت کمزور ہوتی چلی جائے گی۔ لوگ اگر آپ کو بُرے کاموں سے روکتے ہیں اور آپ جھوٹا وعدہ کرتے ہیں اور ان کی تکلیف کا خیال نہیں کرتے تو اخلاقی طور پر یہ انتہائی غلط بات ہے۔

جون کے آخر میں رمضان المبارک کا آغاز ہو رہا ہے۔ رمضان المبارک کی پیشگی مبارک باد قبول کریں۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے: اے ایمان والو! تم پر (رمضان کے) روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح ان لوگوں پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کا ارشاد ہے: جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ ایک دروازے کا نام ریان ہے۔ اس دروازے سے صرف روزے دار ہی (جنت میں) داخل ہوں گے۔ ہمارے جن ساتھیوں پر روزے فرض ہیں، ہمیں یقین ہے کہ وہ پورے روزے رکھیں گے اور سحری و افطاری میں جو کچھ دسترخوان پر موجود ہوگا، ہنسی خوشی کھا لیں گے۔ روزہ قسم قسم کی لذیذ و خوش ذائقہ چیزیں کھانے کے لیے نہیں رکھا جاتا۔ اس کا مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا اور پرہیزگار بننا ہے۔

اس مہینے سے اسکولوں میں موسم گرما کی تعطیلات ہو رہی ہیں۔ آپ نے اس کے لیے کیا منصوبہ بندی کی ہے؟ آپ ہوم ورک، کھیل کود اور سیر و تفریح کا ٹائم فریم بنا لیں تاکہ آپ کو آسانی رہے اور وقت کا بہترین استعمال ہو۔

لیجیے، اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی تنقید و تجاویز سے آگاہ کریں۔ آپ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

فی امان اللہ!

(ایڈیٹر)

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: جاگو جاگو ہوا سویرا

خط و کتابت کا پتا

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔

UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816

E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com

tot tarbiatfs@live com

پرنٹر: ظہیر سلام

مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔

سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)=850 روپے۔

مشرق وسطی (ہوائی ڈاک سے)=2400 روپے۔

ایشیاء، افریقہ، یورپ (ہوائی ڈاک سے)=2400 روپے۔

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)=2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ 30 روپے

سچ کی خوشبو

پیارے بچو!

جب آپ بازار سے کوئی چیز خریدتے ہیں تو اس پر اس کے استعمال کا طریقہ لکھا ہوتا ہے۔اگر اس چیز کو اس طریقے کے مطابق استعمال کیا جائے تو وہ چیز درست کام کرتی ہے اور اگر اس چیز کو دی گئی ہدایات کے مطابق استعمال نہ کیا جائے تو اس کے خراب ہونے کا ڈر رہتا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو پیدا کیا۔ناک،کان،دل و دماغ اور زبان جیسے اعضاء دے کر سجایا اور سنوارا ہے۔زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایا اور ان اعضاء کے استعمال کے لیے مختلف ہدایات دیں۔ہمارے انہی اعضاء میں سے ایک عضو" زبان" بھی ہے۔زبان کے استعمال کے سلسلے میں قرآن و حدیث میں مختلف ہدایات دی گئی ہیں۔ان میں سے ایک ہدایت یہ ہے کہ"ہمیشہ سچ بولا جائے اور جھوٹ سے بچا جائے۔"

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔" (التوبہ:119)

یہ بات یقینی ہے کہ ہم اپنے ماحول کا اثر قبول کرتے ہیں۔ جیسا ماحول ہوتا ہے، ویسا ہی رنگ ہمارے اعمال و افعال پر چڑھتا ہے۔اگر ماحول اچھا اور نیکی کا ہے تو آپ نیکی اور اچھائی کو اختیار کرتے ہیں اور اگر ماحول بُرا اور گناہوں کا ہے تو آپ بُرائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔اس آیت میں سچے لوگوں کے ساتھ رہنے کا حکم دیا،کیوں کہ سچے لوگوں کے ساتھ رہنے سے سچائی کا اثر آپ کے دل و دماغ میں آئے گا اور آپ سچائی ہی کو پھیلائیں گے۔

ایک حدیث شریف میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:"بے شک سچائی نیکی کی طرف راہ نمائی کرتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔اور بے شک آدمی سچ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیق یعنی سچا لکھ دیا جاتا ہے اور بے شک جھوٹ، بُرائی اور نافرمانی کی طرف راہ نمائی کرتا ہے اور نافرمانی دوزخ کی طرف لے جاتی ہے۔اور بے شک آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں کذاب یعنی بڑا جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔"

(بخاری، کتاب الادب:6094،مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب:2607)

اس حدیث میں سچ بولنے اور جھوٹ بولنے کا انجام بتایا گیا ہے کہ سچ بولنے والا ہمیشہ ہدایت اور خیر پر رہتا ہے اور یہی خیر اس کو جنت تک پہنچا دے گی جب کہ جھوٹا شخص ہمیشہ بہانوں کی آڑ میں رہتا ہے اور اپنے ایک جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے اس کو سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔اگر وہ اپنے جھوٹ سے وقتی فائدہ حاصل کر بھی لے لیکن آخر کار اس کے جھوٹ کا پول کھل جاتا ہے اور ذلت اور رسوائی اس کا مقدر بنتی ہے۔اگر دُنیا میں اس کا جھوٹ ظاہر نہ بھی ہو تو آگے آنے والی زندگی، آخرت میں اس کے جھوٹ سے پردہ اٹھ جائے گا اور سب لوگوں کے سامنے شرمندگی و رسوائی ہوگی۔

پیارے بچو! یہ عہد کریں کہ آپ ہمیشہ سچ بولیں گے کیوں کہ سچ بولنے سے عزت ملتی ہے اور ہاں! جھوٹ کے قریب بھی نہیں جانا، کیوں کہ کوئی بھی ذلت کو قبول نہیں کرنا چاہتا۔

......☆......

شہزادی مرحبا اپنے والدین یعنی بادشاہ سلامت اور ملکہ عالیہ کے ساتھ خوش وخرم زندگی گزار رہی تھی۔ وہ بہت خوب صورت اور نیک سیرت تھی اور بادشاہ سلامت کو اس پر ناز تھا۔ اچانک ایک دن وہ غائب ہوگئی اور پھر دو ماہ تک بسیار کوشش کے باوجود اس کی کہیں خبر نہیں ملی۔ آخر ایک دن شمال سے آنے والی ٹھنڈی یخ بستہ ہوا کا گزر بادشاہ کے محل سے ہوا تو اس نے بادشاہ کو شہزادی کے متعلق پہلی خبر دی کیوں کہ ہوا تو کہیں بھی جا سکتی ہے۔ اب وہ سارے محل میں سرسراتی پھر رہی تھی۔ وہ اتنی سرد تھی کہ ملکہ اور بادشاہ باقاعدہ کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنی سائیں سائیں کرتی آواز میں ان کو بتایا کہ اس نے شہزادی کو دیکھا ہے۔ ''اے سرد ہوا فوراً بتاؤ کہ میری بیٹی کہاں ہے؟'' بادشاہ نے چلّا کر پوچھا تو ہوا نے بادشاہ کو بتایا کہ وہ خواب نگر میں ہے، جہاں سب سے بڑے جادوگر فرقان نے اسے اپنے پتھر کے قلعے میں قید کر رکھا ہے۔ ہوا یہ بتاتے ہوئے اتنے جوش میں تھی کہ اس کے زور سے بادشاہ کے سر پر پہنا ہوا تاج ایک جانب سرک گیا۔

''میں نے قلعے کی کھڑکی سے اسے جھانکتے دیکھا تھا۔ پھر میں نے اس کے سنہری بالوں کو چھوا تو مجھے فوراً معلوم ہوگیا کہ وہ شہزادی مرحبا ہی ہے۔ بادشاہ سلامت! اگر آپ شہزادی کی واپسی چاہتے ہیں تو آپ کو فوراً فرقان جادوگر کو پیغام بھجوانا چاہیے۔'' بادشاہ نے ہوا کے دیے ہوئے صائب مشورے کا شکریہ ادا کیا۔ پھر بادشاہ کے سامنے ہوا کورنش بجا لائی اور تیزی سے محل سے روانہ ہوگئی مگر اپنی تیزی کی وجہ سے محل میں لگے ہوئے بھاری پردوں کو اتھل پتھل کر گئی اور پھولوں کا ایک گل دان بھی کارنس سے زمین پر آگرا۔ بادشاہ سلامت نے فوراً اپنے وزیروں کی میٹنگ بلائی۔ میٹنگ میں سب سر جوڑ کر بیٹھے رہے کہ شہزادی کو کس طرح چھڑوایا جائے لیکن ان میں سے کوئی بھی اتنا ہمت والا نہیں تھا کہ فرقان جادوگر تک جانے کے لیے اپنی خدمات پیش کرتا۔ آخر تھک ہار کر بادشاہ نے شمال سے سرد ہوا کو پھر طلب کیا۔ اسے حکم دیا کہ وہ خود ہی جا کر فرقان جادوگر سے پوچھے کہ وہ کس شرط پر شہزادی کو رہا کرے گا۔ ہوا جانے کے لیے فوراً تیار ہوگئی کیوں کہ وہ تو کسی سے بھی خائف نہیں تھی۔ اس نے دوبارہ ایک جھونکے کی صورت میں واپسی اختیار کی تو محل کے قالینوں سے جو تھوڑی بہت گرد اڑی، اس سے بادشاہ اور اس کے نازک وزیر کئی ساعتوں تک کھانستے رہے۔ دو روز بعد وہ خواب نگر سے واپس لوٹی۔ اس نے وہاں تک کا سفر بڑی سرعت سے طے کیا تھا۔ پھر اس نے

فرقان جادوگر کا پیغام بادشاہ تک پہنچایا۔ وہ پیغام کچھ اس طرح تھا کہ بادشاہ کو اپنے تمام وزراء سمیت خواب نگر تک کا سفر کرنا پڑے گا۔ ''وہ آپ کو شہزادی تب واپس کرے گا، اگر آپ اس کی تین شرطیں پوری کریں گے۔'' یہ بات کرتے ہوئے شمالی ہوا نے محل میں ایک چکر لگایا تو بادشاہ کو اپنی خلعت سنبھالنی مشکل ہو گئی۔ واقعی شمالی ہوا میں نزاکت نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ ''میں بادشاہ ہوں۔ میں اپنی دولت سے جادوگر کی ہر شرط پوری کر سکتا ہوں۔ تم مجھے اس کی شرطیں بتاؤ۔'' بادشاہ نے ہوا سے کہا۔ ''سب سے پہلے تو آپ فرقان جادوگر کے لیے کوئی ایسی چیز لے کر جائیں گے جس پر کبھی کسی کی نگاہ نہ پڑی ہو، یعنی سب سے پہلے فرقان جادوگر کی نگاہ اس پر پڑے۔ آپ نے دوسرے نمبر پر فرقان جادوگر کو کوئی ایسا کام بتانا ہے جو وہ کر نہ سکے لیکن مجھے امید نہیں کہ دُنیا میں کوئی ایسا کام ہو جسے فرقان جادوگر پورا نہ کر سکے۔ پھر آخری شرط یہ ہے کہ جب آپ فرقان جادوگر کے دربار میں پیش ہوں تو آپ کو بتانا ہوگا کہ اس وقت فرقان جادوگر کیا سوچ رہا ہے۔'' جب ہوا نے بادشاہ کو یہ شرطیں بتائیں تو اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی مشکل شرطیں وہ کیسے پوری کرے گا جن کو پورا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ پہلی شرط تو شاید وہ پوری کر لے اور زمین کے پاتال سے وہ کوئی ایسا قیمتی ہیرا نکلوا لے جو دُنیا میں آج تک کسی نے نہ دیکھا ہو لیکن جو بھی اسے وہاں سے لے کر آئے گا، اس کی نظر تو اس پر ہر صورت میں پڑے گی، حالانکہ شرط یہ ہے کہ دُنیا میں اس چیز پر سب سے پہلی نظر جادوگر کی پڑنی چاہیے۔ پھر دوسری شرط یہ ہے کہ وہ ایسا کون سا کام فرقان جادوگر کو بتائے جو وہ پورا نہ کر سکے۔

اور پھر آخری شرط میں کیسے جانوں گا کہ فرقان جادوگر اس وقت کیا سوچ رہا ہے۔ بادشاہ نے ہوا کو پوچھا کہ اگر وہ کامیاب نہ ہوا تو؟ ''تو پھر آپ اور آپ کے تمام وزراء فرقان جادوگر کے نوکر بن جائیں گے۔'' ہوا نے جواب دیا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم نہ ہی جائیں، ورنہ سب کو ایک جادوگر کا نوکر بننا پڑے گا۔'' بادشاہ نے سر جھکا کر کہا لیکن ملکہ ماں بھی تھی۔ وہ ہر صورت شہزادی کو چھڑوانا چاہتی تھی، خواہ اسے بھی بادشاہ اور وزراء کے ساتھ جادوگر کی نوکرانی بننا پڑے۔ اس نے بادشاہ کو ہر صورت چلنے پر مجبور کیا لیکن بادشاہ کو اس نے پہلے وہ چیز تلاش کرنے کو کہا جسے جادوگر سے پہلے کبھی کسی نے نہ دیکھا ہو۔ بادشاہ، ملکہ، وزراء اور سب کے اکٹھے سوچنے کے بعد جو سب سے اچھا آئیڈیا ان کے ذہن میں آیا، وہ یہ تھا کہ وہ ایک اندھے بونے کو پاتال بھیجیں جو وہاں سے کوئی ہیرا ڈھونڈ کر لائے۔ اندھا ہونے کی وجہ سے وہ خود اسے نہیں دیکھ سکے گا۔ بونا ہیرے کو ایک تھیلی میں بند کر کے ہمیں لا دے جسے سب سے پہلے فرقان جادوگر ہی کھولے۔ ''لیکن بونا اگر ہیرے کی بجائے کوئلہ تھیلی میں ڈال کر لے آیا تو پھر کیا ہوگا؟'' بادشاہ سلامت نے ملکہ کے اس سوال کے جواب میں کہا کہ راستہ لمبا ہے، یہ باتیں راستے میں سوچیں گے۔

بونا پاتال میں گیا اور تھیلی میں کچھ ڈال کر لے آیا۔ بادشاہ نے ہاتھ لگا کر اسے محسوس کیا تو تھیلی میں پتھر جیسی کوئی چیز تھی۔ بادشاہ نے دعا مانگی کہ کاش وہ کوئی ہیرا ہی لایا ہو اور پھر وہ سفر پر روانہ ہو گئے۔ وہ کل ملا کر ایک سو دو افراد تھے جن میں کچھ بگھیوں اور کچھ گھوڑوں پر سوار تھے۔ راستے میں بادشاہ نے سوالوں کے جوابات کا بہتیرا سوچا مگر اسے کوئی حل سمجھ میں نہ آیا۔ آخر یہ قافلہ خواب نگر جا پہنچا۔ خواب نگر عجیب و غریب جگہ تھی۔ آسمان اتنا نیچا لگ رہا تھا جیسے کسی مکان کی چھت ہو۔ دُور پہاڑی کی چوٹی پر فرقان جادوگر کا عظیم الشان قلعہ نظر آ رہا تھا کیوں کہ وہ نیلے اور سنہری پتھروں سے بنایا گیا تھا، لہٰذا وہ دُور سے چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بادشاہ کا قافلہ جب پہاڑ کے نیچے وادی میں پہنچا تو رات ہو گئی تھی، لہٰذا بادشاہ کے ملازموں نے وہیں خیمے گاڑ دیے اور خود کھانا بنانے لگے۔ سب نے اکٹھے کھانا کھایا مگر اس دوران سب گم صم بیٹھے رہے۔ کسی نے کسی سے کوئی سوال نہیں کیا۔ بادشاہ پریشانی سے ساری رات نہیں سویا۔ منہ اندھیرے وہ خیمے سے نکلا اور وادی میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ آخر تھک کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ اچانک اسے ایسا لگا جیسے اس کا ہاتھ کوئی چاٹ رہا ہو۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو ایک گڈریا لڑکا اس کے قریب کھڑا تھا اور بھیڑوں کی رکھوالی والا اس کا کالے رنگ کا کتا جس کے سارے جسم پر لمبے لمبے سیاہ گھنگھریالے بال تھے، بادشاہ کا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔

گڈریے نے بادشاہ سے اس کی پریشانی کے بارے میں پوچھا تو بادشاہ نے اسے بتایا کہ وہ اور اس کے تمام ساتھی جادوگر کے ملازم بننے جا رہے ہیں۔ گڈریے نے بادشاہ سے پوچھا کہ ابھی وقت ہے، وہ بھاگ کیوں نہیں جاتے؟ بادشاہ نے اسے سارا قصہ سنایا کہ وہ اپنی بیٹی کو چھڑانے آیا ہے اور پھر اسے تینوں شرطوں کا بھی بتایا کہ ہو سکتا ہے وہ پہلی شرط پوری بھی کر لے مگر باقی دونوں شرطیں پوری کرنا ناممکن ہے۔ گڈریے نے یہ شرطیں سنیں تو بے اختیار ہنسنے لگا۔ اس نے بادشاہ کو کہا کہ یہ تو بڑی آسان شرطیں ہیں۔ وہ انہیں آسانی سے پورا
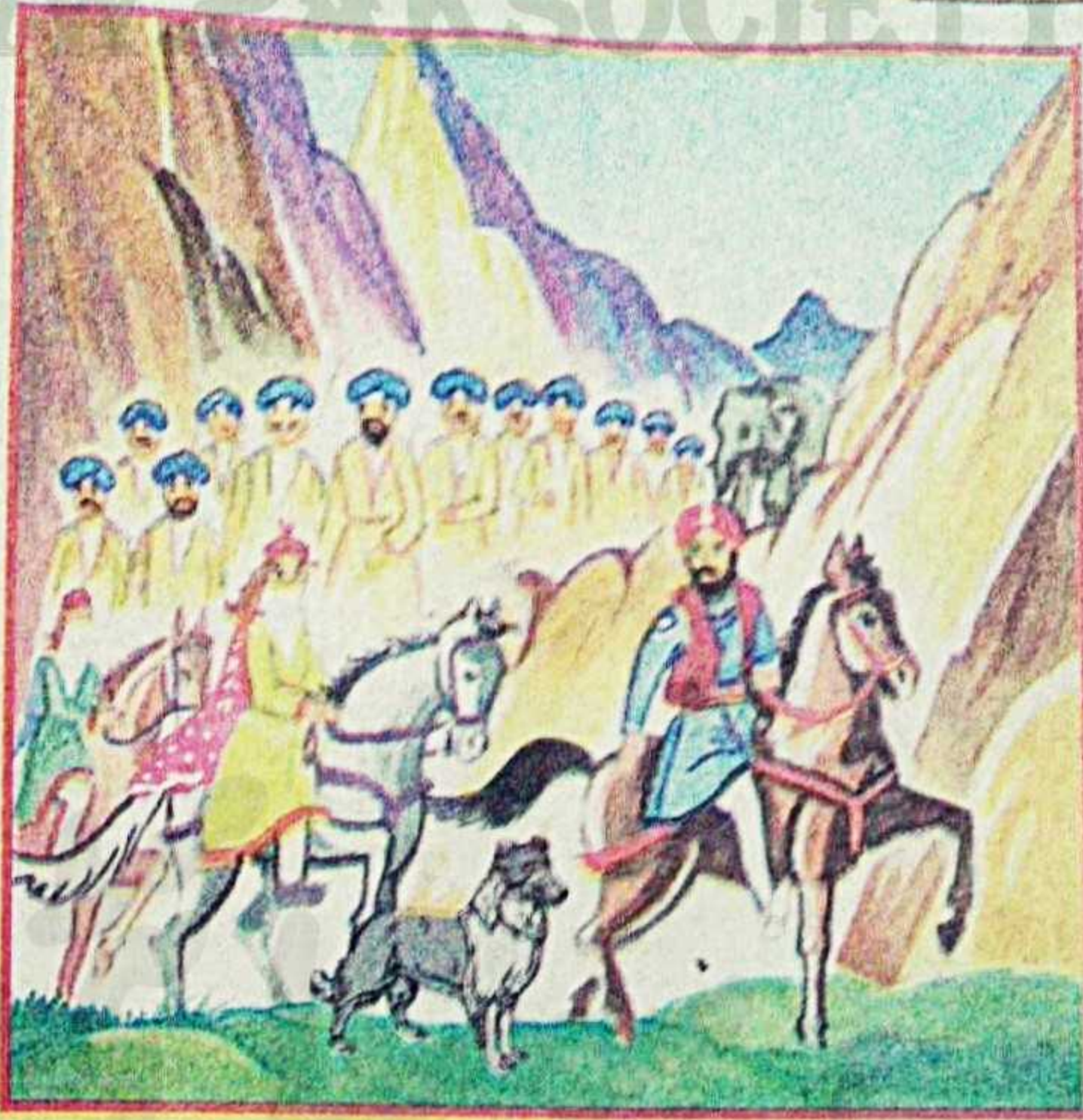
کر سکتا ہے۔ بادشاہ اس کو حیرانی سے گھورنے لگا۔ اس نے گڈریے کو کہا کہ اگر وہ شرطیں پوری کر دے تو وہ وعدہ کرتا ہے کہ شہزادی کی شادی اس سے کر دے گا۔

گڈریے نے بادشاہ کو بتایا کہ اس نے خوب صورت شہزادی کو کھڑکی میں کھڑے ہوئے دیکھا ہے اور وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے مگر آج اسے بادشاہ کا بھیس بدل کر جادوگر کے پاس جانا ہوگا، تبھی اسے شکست دی جا سکتی ہے۔

بادشاہ خوشی سے راضی ہوگیا۔ پھر بادشاہ اپنے مصاحب کے پاس گیا اور انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

گڈریا اور اس کا گھنگھریالے بالوں والا کتا بھی ان کے ساتھ تھا۔ ملکہ اور تمام وزراء بادشاہ کا فیصلہ مان گئے لیکن بادشاہ کے سب سے پرانے وزیر نے گڈریے کو بتا دیا کہ اگر وہ شرطیں پوری نہ کر سکا تو وہ خود اس کا سر قلم کر دے گا۔ پھر گڈریے نے بادشاہ کا شاہی لباس پہنا اور سر پر شاہی تاج رکھ لیا۔ اب اسے کوئی نہیں پہچان سکتا تھا کہ وہ بادشاہ ہے یا نہیں۔ بادشاہ نے خود وزیروں جیسا لباس زیب تن کر لیا۔ پھر گڈریا قلعے میں جانے کے لیے پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ راستے میں اس نے ایک جھاڑی میں سے کوئی چیز اٹھا کر اپنی جیب میں ڈالی، مگر بادشاہ نہ دیکھ سکا کہ وہ کیا چیز تھی۔ آخر کار وہ قلعے کے دروازے پر پہنچ گئے اور پھر قلعے کے دروازے پر زور سے دستک دی۔ دروازہ خود بخود کھل گیا اور سب قلعے کے اندر داخل ہوگئے۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے، دروازہ خود بخود بند ہوگیا۔ سب سوچ رہے تھے کہ پتا نہیں اب کبھی یہ دروازہ کھلے گا بھی یا نہیں۔ پھر وہ سب کئی کمروں سے گزر کر جادوگر کے کمرے تک پہنچے۔ کمروں کی چھتیں اتنی اونچی تھیں جیسے آسمان ہو اور جن ستونوں پر یہ چھتیں کھڑی تھیں، وہ ستون لگتا تھا جیسے سبز رنگ کی آگ سے بنے ہوئے ہیں۔ جادوگر اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ قد و قامت میں وہ کسی جن سے کم نہیں تھا۔ اس کی بڑی بڑی سبز آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے ان میں زمرد جڑے ہوں۔ ”اچھا! تو تم آ گئے ہو۔“ اس نے گڈریے کو بادشاہ سمجھ کر پوچھا۔ ”تم سمجھتے ہو کہ ذہانت سے تم شہزادی کو واپس لے جاؤ گے تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم ساری زندگی میرے غلام بن کر رہو گے اور شہزادی ساری عمر میرے پاس رہے گی۔“ ”لیکن اگر میں نے تمہیں شکست دے دی تو تم یہاں سے قلعہ چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلے جاؤ گے۔“ گڈریے نے بے خوفی سے جادوگر کو جواب دیا۔ جادوگر کے غصے سے ستونوں کی آگ سبز سے سرخ ہوگئی۔ پھر اس نے گڈریے سے اپنی پہلی شرط کا جواب پوچھا۔ وہ کہنے لگا کہ ضرور وہ کوئی پاتال یا سمندر کی تہہ سے کوئی ہیرا نکال کر لایا ہوگا مگر اسے بھی کسی نہ کسی مچھلی یا حشرات الارض میں سے کسی نے دیکھ لیا ہوگا۔ ”نہیں، میں کوئی ایسی چیز لایا ہوں جسے کسی چرند پرند یا کیڑے مکوڑے نے ابھی تک نہیں دیکھا۔“ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک اخروٹ نکال کر جادوگر کے سامنے رکھ دیا۔ ”اب اس اخروٹ کو کھولو تو اس میں تمہیں گری ملے گی جسے ابھی تک کسی نے نہیں دیکھا۔“ جادوگر حیران ہوگیا۔ غصے سے اس نے آگ کے شعلوں کو اس دفعہ نارنجی کر دیا۔ اس کے غصے سے سبھی ڈر گئے مگر گڈریا بالکل نہیں گھبرایا۔ اس نے جادوگر کو کہا کہ اگر وہ چاہے تو وہ یہ اخروٹ توڑ کر دکھا بھی سکتا ہے مگر جادوگر نے کہا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ”ٹھیک ہے، تم نے پہلی شرط تو پوری کر دی۔

اب دوسری شرط کے بارے میں بتاؤ کہ کون سا ایسا کام ہے جو میں نہیں کر سکتا۔" گڈریے نے منہ سکوڑ کر ایک مخصوص سیٹی بجائی تو اس کا گھنگھریالے بالوں والا سیاہ کتا بھاگا بھاگا اس کے پاس آ گیا۔ اس نے اسے جادوگر کے حوالے کیا اور جادوگر کو کہا کہ اس کے گھنگھریالے بال سیدھے کر دو۔ جادوگر کتے کے اتنے گھنگھریالے بال دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ اس نے کئی دفعہ کتے کے بال سیدھے کیے مگر وہ دوبارہ ویسے کے ویسے ہی ہو گئے۔ اس نے جادو کی استری منگوائی اور اس سے کتے کے بال استری کیے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ بال خشک ہو کر اور گھنگھریالے ہو گئے۔ اس نے جھنجھلاہٹ میں کئی جنتر منتر پڑھے جس سے کتے کے بال کئی دفعہ سیدھے ہوئے مگر جیسے ہی جادوگر خاموش ہوا، بال پھر اپنی ہیئت بدل کر گھنگھریالے ہو گئے۔ غصے سے جادوگر آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ گڈریے کے علاوہ سب لوگوں کا خوف سے بُرا حال تھا۔ ستونوں کی آگ کا رنگ بھی جادوگر کے موڈ کی طرح بدل رہا تھا۔ آخر جادوگر نے مان لیا کہ دوسری شرط بھی پوری ہو گئی۔ پھر اس نے گڈریے کو کہا کہ اب تیسری شرط پوری کرو۔ اس نے یہ بھی مان لیا کہ بادشاہ اس کی توقع سے زیادہ چالاک ہے۔

گڈریے نے جادوگر سے پوچھا کہ اب وہ یہ چاہتا ہے کہ اسے بتایا جائے کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہا ہے؟ جادوگر ہنس کر بولا کہ یہ بتانا ناممکن ہے مگر گڈریے نے انتہائی اونچا قہقہہ لگایا کہ سارے قلعہ میں اس کی آواز گونجی۔ سارے حاضرین اس کا قہقہہ سن کر ششدر رہ گئے۔ جادوگر بھی حیران رہ گیا۔ گڈریے نے اسے بتایا کہ وہ اس کے خیالات آسانی سے پڑھ سکتا ہے، اس لیے ہنس رہا ہے۔ اس نے اپنے قیمتی کپڑے اتار پھینکے اور گڈریوں والے کپڑوں میں حیران و پریشان جادوگر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے جادوگر کو کہا کہ وہ سچ بتائے کہ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ میں بادشاہ ہوں؟ اگر یہ صحیح ہے تو تمام شرطیں پوری ہو گئی ہیں۔ جب جادوگر نے اپنی شکست فاش دیکھی تو وہ اونچی آواز میں غرایا اور اسی طرح کی آوازیں آگ کے ستونوں میں سے بھی آنے لگیں۔ قلعہ تھرتھرانے لگا اور ایک زوردار دھماکے سے کتنے ہی ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا۔ تمام ٹکڑے ہوا میں اُڑتے ہوئے جادوگر کو بھی ساتھ لے گئے۔ بادشاہ، ملکہ اور تمام وزراء قلعے کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ پھر بادشاہ کو مرحبا کی یاد آئی۔ اسے ایسا لگا کہ کہیں جادوگر اسے ساتھ ہی نہ لے گیا ہو مگر نہیں، شہزادی اچانک قریب ہی سے نمودار ہوئی اور اپنے باپ سے لپٹ گئی۔ اس نے گڈریے کو اس کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کیا کیوں کہ وہ قلعہ میں ہونے والی ساری کارروائی ساتھ والے کمرے سے سن رہی تھی۔ پھر سارا قافلہ جس میں اب گڈریا اور اس کا گھنگھریالے بالوں والا کتا بھی شامل تھا، واپس اپنے ملک کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے ملک کے لوگ دوبارہ بادشاہ کے ساتھ شہزادی کو دیکھ کر بہت خوش تھے۔ اپنے ملک پہنچتے ہی شہزادی کی شادی گڈریے سے ہو گئی۔

شادی کے شادیانوں کی آواز اتنی بلند تھی کہ دُور دراز کسی جگہ فرقان جادوگر بھی یہ آوازیں سن کر غصے سے پیچ و تاب کھاتا رہا لیکن اب وہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا، کیوں کہ گڈریے کے ہاتھوں شکست کھا کر اس کا غرور خاک میں مل چکا تھا اور وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں تھا۔ ☆☆☆

دل چسپ و عجیب

1۔ سیل پانی کا جانور ہے مگر اس کی مادہ خشکی پر بچے دیتی ہے۔ جب یہ بچہ بڑا ہوتا ہے تو وہ سمندر میں جاتے ہوئے ڈرتا ہے لیکن ماں زبردستی اسے پانی میں لے جاتی ہے اور تیرنا سکھاتی ہے۔

3۔ گینڈا جنگلی جانوروں میں سب سے زیادہ غصیلا ہوتا ہے۔ انسان یا جانور کو دیکھتے ہی یہ بھڑک اٹھتا ہے اور اپنا سینگ اٹھا کر مارنے کو دوڑتا ہے۔ اس کی نگاہ بہت کمزور ہوتی ہے۔ یہ ہندوستان کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔

2۔ ہاتھی اپنی سونڈ سے کھاتا پیتا ہے۔ لڑائی کے وقت یہی سونڈ ہتھیار کا کام دیتی ہے لیکن بعض اوقات یہ جھولے کا کام بھی دیتی ہے۔ ہتھنی جب کبھی دُور جاتی ہے تو اپنے بچے کو سونڈ میں اٹھا کر لے جاتی ہے۔

4۔ افریقہ میں ایک عجیب و غریب پودا پایا جاتا ہے۔ اس کا پھول دن میں کھلتا ہے اور شام کو بند ہو جاتا ہے۔ جو شہد کی مکھیاں شام کو آ کر پھول کا رس چوستی ہیں وہ اس پھول میں بند ہو جاتی ہیں اور صبح کو جب پھول کھلتا ہے تو باہر نکلتی ہیں۔

ہم بھی آخر بچے ہیں

مومنہ احسن

"تم کیا سڑک کے درمیان پھر رہے ہو؟ چلو! گھر جا کر بیٹھو۔ ماں باپ اسکول نہیں بھیج سکتے تو گلیوں میں آوارہ گھومنے کے لیے بھیج دیتے ہیں۔" مہران نے سڑک پہ اچانک گاڑی کے سامنے آجانے والے ننگ دھڑنگ بچے کو جھڑکا اور بڑبڑاتا ہوا واپس آ گیا۔ "نجانے کیسے لاپرواہ ماں باپ ہیں۔ بچوں کو کپڑے تک نہیں لے کر دے سکتے اور پھر یوں آوارہ گھومنے کی اجازت دے رکھی ہے جیسے ساری سڑک ان کی ملکیت ہے اور پھر اگر ایکسیڈنٹ ہو جائے تو واویلا کرنا شروع کر دیتے ہیں...... جاہل، گنوار کہیں کے......!"

مہران گاڑی پر اپنے شان دار بنگلے کے سامنے سے نکلا تھا کہ اچانک ایک لڑکا سڑک کے بیچوں بیچ آ کھڑا ہوا۔ معصومیت، شکل سے ٹپک رہی تھی۔ شکل وصورت کے لحاظ سے خوب صورت مگر حلیہ یہ کہ جسم پر نہ کوئی لباس اور نہ ہی پیروں میں چپل......! گرد وغبار سے اَٹے پیر اور جسم پر من من میل جو اس بات کی نشان دہی کرتی تھی کہ مہینوں سے نہایا نہیں گیا۔

مہران ایک لمحے کے لیے اس کی حالت پر ترس کھاتا رکا تو تھا مگر ایسا غصہ آیا کہ وہ بچے کی ناسمجھی کو بھی خیال میں نہ لایا اور اسے جھڑک کر گاڑی آگے بڑھا کر لے گیا۔ بچے کو جس زوردار انداز سے جھڑکا گیا، وہ وہیں سہم گیا مگر مہران نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ مہران کے ساتھ ہی بیٹھے، اس کے والد اچانک ہی سوچوں میں گم ہو گئے اور یہ حالت مہران سے چھپی نہ رہ سکی۔ وہ خاموش رہا۔

سارا راستہ نہ اس کے والد نے بات کی نہ اس نے، حالاں کہ سفر کے دوران وہ اکثر مہران کو ٹوکتے تھے۔ کبھی ڈرائیونگ اور کبھی ملکی حالات گفتگو کا محور ہوتے۔ یہ ان کا معمول تھا مگر اس واقعے کے بعد انہوں نے مہران سے کوئی بات نہ کی جس سے اسے پریشانی لاحق ہوئی۔

گھر پہنچے تو مہران تر و تازہ ہو کر کھانے کی میز پر پہنچا تو ابو کی خاموشی دوبارہ اس پر عیاں ہو گئی کیوں کہ کام کے دوران سارا دن وہ اتنا مصروف تھا کہ اسے یاد ہی نہیں رہا۔ ابھی یہ خیال آیا ہی تھا کہ اس کی نظر کھانے پر پڑی تو اسے مزید غصہ آ گیا۔ "امی! یہ کیا......؟ آج پھر دال؟ آخر یہ اتنا پیسہ کس لیے ہے؟ روزانہ دال...... کچھ اور نہیں پک سکتا ہمارے گھر......؟" مہران چیخا تو امی خفا ہو گئیں اور بولیں:

"بیٹا! پیسے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم میانہ روی اور سادگی کو بھول جائیں۔"

"آپ ان سب کا خیال رکھیں، میرا نہیں۔" یہ کہہ کر مہران

کھانے کو دھتکار کر چلا گیا۔ ابو چپ چاپ دیکھتے رہے۔ یہ آج کا نہیں روز کا معمول تھا۔ جس دن مہران کی پسند کا کھانا نہ بنتا وہ یونہی کرتا۔ وہ ہر لحاظ سے فرماں بردار تھا مگر جہاں بات پسند کی آتی، وہ وہیں نافرمانی کی حدیں پار کرتا۔

اس کی امی نے کئی بار دھیرے دھیرے سمجھایا۔ اللہ سے رو رو کر اس مسئلے کا حل چاہا مگر بے سود۔ پھر بھی اللہ سے مایوس نہیں تھیں کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ اللہ کے ہاں دیر ہے پر اندھیر نہیں مگر آج کے واقعے سے ابو کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ امی کے لاکھ روکنے پر، نہ نہ کرنے کے باوجود ابو غصے میں مہران کے کمرے میں گئے۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا جب ابو نے ایک زور دار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ وہ اس اچانک حملے سے دم بخود ہو گیا۔ ابو نے آج تک مہران پر ہاتھ نہ اٹھایا تھا مگر آج غصے سے ان کا بُرا حال تھا۔ آخر کافی توقف کے بعد وہ بولے:

"اپنا لہجہ درست کرو۔ ماں کے ساتھ یوں بات کرتے ہیں۔ چلو ان بچوں کا نہیں تو کم از کم ماں کے درجے کا ہی احترام کر لو...... شکر ادا کرو کہ اللہ نے تمہیں ہر چیز عطا کی ہے مگر اپنی اصلیت مت بھولو۔ ان لوگوں کو دیکھو جو روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرتے ہیں، کوڑے کے ڈھیر سے کھانے کے ٹکڑے چنتے ہیں مگر حرفِ شکایت منہ پر نہیں لاتے۔ کتنی منتوں سے مانگا تھا تمہیں مگر آج تمہارے لہجے کے بعد میرے دل میں یہ خواہش اٹھی کہ کاش! میرا بیٹا نہ ہوتا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ تم مصباح بنو گے مگر وہ میری غلط فہمی تھی۔"

ابو غصے میں بولتے چلے گئے تو مہران کو اس حملے کی وجہ پتا نہ چلنے کے ساتھ ایک نام پر سوئی اٹک گئی۔ ہزاروں سوال ذہن میں گردش کرنے لگے۔ مصباح......؟ آخر کار وہ بولا:

"کون مصباح؟" مہران بولا تو ابو نے شفقت آمیز آنکھوں سے جو اس وقت آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں، دیکھا اور بولے:

"آؤ! میں تمہیں بتاؤں کہ وہ اپنے ماں باپ کی کیسی خوب صورت بیٹی تھی...... کتنے خوش نصیب تھے اس کے والدین۔"

یہ کہہ کر ابو نے مہران کو کاندھے سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا اور بولے: "جس طرح آج اس جگہ وہ ننھے ننھے پھول ننگ دھڑنگ کھیل رہے تھے، آج سے کافی عرصہ پہلے ویسے ہی حلیے میں ایک بچہ رہا کرتا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اس نے شلوار پہن رکھی تھی اور اسکول کے پچھلے کوارٹر میں کوڑے کے ڈھیر سے پھٹی کتاب پکڑے، نظریں کتاب پر اور ہاتھ کوڑے کے ڈھیر سے روٹی کا ٹکڑا ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔

اتنے میں کلاس سے ایک ٹیچر نکلی اور اس بچے کو یوں بیٹھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ اسے یونہی بیٹھا دیکھتی مگر کچھ نہ کہتی۔ وہ لڑکا روزانہ اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا اور وہ چلی جاتی مگر اس دن منظر بدل گیا۔ وہ جانے کی بجائے مڑی اور ادھر آ گئی جدھر بچہ بیٹھا تھا۔ بچہ سمجھا شاید اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ اس نے کتاب پھینک دی۔ وہ ٹیچر آئی مگر کچھ کہے بغیر اس کا ہاتھ تھاما اور اسے لے جا کر ہاتھ منہ دھلوایا اور پیار کرتے ہوئے بولی: "بیٹا! آپ پڑھتے کیوں نہیں؟" یہ پہلا سوال تھا جس کو سننے کے بعد وہ لڑکا جو تقریباً دس برس کا ہو گا، بولا:

"میں کیسے پڑھوں مس؟ میرے اماں ابا تو مجھے روٹی تک نہیں لے کر دے سکتے مگر مجھے پڑھنے کا شوق ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ میں نے الف سے اللہ اور ب سے بسم اللہ سیکھی ہے۔ وہ جب آپ پڑھا رہی تھی ناں...... تب۔"

یہ کہہ کر اس کے معصوم چہرے پر ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔ مصباح اسے ہنستا دیکھ کر بولی:

"اچھا! آپ روزانہ آ جایا کرو، میں آپ کو پڑھاؤں گی۔ ٹھیک ہے کل آؤ گے ناں؟"

وہ اس کی جواب کی منتظر تھی جب لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس پر اس کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا۔ پھر اس نے بچے کو بسکٹ، ٹافیاں اور دوسری چیزیں جو اس نے کبھی نہیں کھائی تھیں، وہ لے کر دیں۔

اگلے دن پھر وہ اُدھر آیا مگر اب وہ کوڑے کے ڈھیر پر نہیں بلکہ کلاس بینچ پر بیٹھا۔ پھر یہ معمول بن گیا کہ مصباح اسے روزانہ پڑھاتی اور وہ دل لگا کر پڑھتا۔ ایک دن مصباح اس کے تین چار جوڑے خوب صورت شلوار قمیص کے لائی اور اسے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ چلا تو اس نے اسے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا اور ساتھ لے گئی۔ اس نے گاڑی کا سفر پہلی بار کیا تھا۔ پھر جب گاڑی رکی تو وہ گھر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سادہ مگر خوب صورت چھوٹا سا گھر جس میں مصباح اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے گھر لے جا کر اسے نہلا دھلا کر کپڑے پہنائے۔ وہ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ اتنے میں اس کے شوہر

کی گاڑی آ کر رکی تو پہلے وہ ٹھٹکا، پھر مصباح کے ایک جملے نے اس پر حقیقت عیاں کر دی اور وہ جملہ وہ آج تک نہیں بھول پایا:

"یہ ہمارا بیٹا ہے۔ پاکستان کے سارے بچے ہمارے بچے ہیں ناں ...... یہ آپ نے مجھے کہا تھا ناں...... دیکھیں کتنا خوب صورت ہے؟" اور اس پر وہ مسکرا دیا۔ پھر انہوں نے اس کے والدین سے اسے مانگ لیا۔ اس کے والدین تشکر بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر وقت پر لگا کر اڑ گیا۔ وہ بچہ مصباح کے پاس رہتا مگر کبھی کبھار اپنے والدین سے بھی ملنے جاتا۔ پھر آج وہی لڑکا مصباح کی شفقت کی وجہ سے ایک این جی او کا مالک بن گیا۔ مصباح اب کمزور ہو چکی ہے مگر اس کی ہمت اور جذبے اب بھی اسے بوڑھا نہیں ہونے دیتے۔"

مہران کے ابو خاموش ہو گئے تو شرمندگی کے آثار مہران کے چہرے پر نمایاں تھے۔ اس کی شرمندگی کم کرنے کے لیے ابو بولے:

"بیٹا! یہ بچے اللہ کے پھول ہیں۔ آج ہمارے حکمرانوں کی نااہلی کی وجہ سے یہ پھول بدنما ہو گئے ہیں مگر مرجھائے نہیں۔ ہم ان کا کل سنوار سکتے ہیں۔ پھر نجانے کتنی دعائیں، ہماری بلائیں ٹال سکتی ہیں...... نجانے کس کی دعا سے ہمارا نصیب کھل جائے۔ پھر اللہ کے حبیبؐ نے بھی تو کہا ہے:

"جو ہمارے چھوٹوں پر رحم اور بڑوں کا احترام نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں۔"

تو کیا بیٹا! ہم اپنے پیارے نبیؐ، اللہ کے حبیبؐ نبی آخرالزماں کو ناراض کر سکتے ہیں؟ نہیں ناں...... غور کرو اگر ان بچوں کی جگہ تم ہوتے، کوئی تم سے اس لہجے میں بات کرتا پھر؟ تمہارا دل ٹوٹتا، تمہارا رونے کو دل کرتا، تمہیں بُرا لگتا ناں......! تو پھر وہ بھی معصوم اور نرم دل کے مالک ہیں۔ بیٹا! مصباح کی طرح روشنی پھیلانے والا چراغ بن جاؤ۔ یاد رکھو روزِ محشر اس کی پوچھ گچھ ہو گی۔"

مہران جو چپ چاپ بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا، بولا:

"ابو! میں مصباح سے اور اس بچے سے ملنا چاہتا ہوں۔"

مہران نے جواب طلب نگاہوں سے اس لڑکے کی طرف دیکھا۔ وہ قدرے تذبذب کا شکار نظر آئے۔ پھر جھجکتے ہوئے بولے:

"مصباح سے تو ملوا دوں مگر لڑکے سے نہیں...... تم ہنسو گے......!"

"پکا وعدہ! نہیں ہنسوں گا...... پلیز......" ابو کا دوستانہ رویہ بحال ہوتا دیکھ کر مہران فوراً بولا تو اس کے ابو نے اپنے بازو پھیلائے اور بولے:

"تو آؤ گلے ملو اس سے۔"

مہران جو تجسس آمیز نگاہوں سے ابو کو دیکھ رہا تھا، پہلے حیران ہوا، پھر امی کی جانب دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھیں مگر ممتا کی آنکھوں میں نمی نے اسے بتا دیا کہ وہ لڑکا کوئی اور نہیں بلکہ اس کے ابو ہیں۔

وہ اٹھا اور ابو کے گلے لگ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آج اس پر سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر رخساروں میں جذب ہونے لگے۔ وہ آج پشیمانی کے تمام آنسو ابو کے گلے لگ کر بہا دینا چاہتا تھا......!

☆☆

پیارے اللہ کے پیارے نام

راشد علی نواب شاہی

اَلْکَبِیْرُ (بہت بڑا)

اَلْکَبِیْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ کے معنی ہیں بہت بڑی شان والا جس کے علاوہ تمام چیزیں اس سے کم تر ہوں۔

میرا تعارف

1۔ **سورج:** دور سے ایک سرخ ٹکیہ کی صورت میں نظر آتا ہوں حالاں کہ جس زمین پر آپ رہ رہے ہیں میں اس سے 13 لاکھ گنا بڑا ہوں۔ اربوں، کھربوں ٹنوں وزنی ٹکیہ بغیر ستون کے قائم ہے۔ میری گرمی سے پھل پکتے ہیں، سردی میں میری دھوپ بہت اچھی لگتی ہے۔ میں مسلسل دن رات حرکت میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے جو راہ مقرر کر دی ہے، ہزاروں سال سے بالکل اسی طریقے پر چل رہا ہوں۔ میرے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے سے کبھی دن بنتا ہے اور کبھی رات۔ ساری زمین کا نظام، روشنی اور حرارت کے ذریعے سے چل رہا ہے۔ وہ ذات جس نے مجھے بنایا وہ مجھ سے بہت بڑا ہے کہ میں تو اس کی بس ایک چھوٹی سی مخلوق ہوں۔ اس کا بنایا ہوا ایک فرشتہ اتنا بڑا ہے کہ اس کا سایہ زمین و آسمان سے زیادہ ہے۔ اس اللہ کی بڑائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک ہے جو اَلْمُتَکَبِّرُ جَلَّ جَلَالُہٗ (بہت بڑائی والا) ہے۔ اَلْکَبِیْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ (بہت بڑا) ہے۔

میں روزانہ طلوع اور غروب ہوتا ہوں۔ یہ پیغام ہے کہ مجھے روزانہ زوال آتا ہے۔ انسان تو میرے سامنے کچھ بھی نہیں، اسے بھی ایک دن زوال آئے گا۔ صرف ایک ذات جس نے مجھے بنایا وہ لازوال ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

2۔ **چاند:** جب میں رمضان شریف میں پہلے دن دکھائی دیتا ہوں تو ساری دنیا میں خوشی پھیل جاتی ہے اور عید کا چاند دیکھنے کے لیے آپ سب بچے تو بے تاب اور بے قرار ہوتے ہیں۔ جوں جوں میری روشنی بڑھتی رہتی ہے، اس سے پھلوں میں مٹھاس آتی ہے۔ چودھویں رات کو میں بہت خوب صورت ہوتا ہوں اور جب میری خوب صورتی عروج پر ہوتی ہے تو پھر میں گھٹنا شروع ہو جاتا ہوں، یہاں تک کہ درخت کی ایک پرانی ٹہنی کی طرح ہو جاتا ہوں۔ میری طاقت نہیں کہ سورج سے ٹکرا جاؤں اور سورج مجھے چھو سکے۔ جس نے مجھے بنایا اس نے میرے لیے راستے مقرر کر دیے ہیں۔ ہزاروں سال سے اسی راستے پر چل رہا ہوں۔ برسوں پہلے بعض لوگوں نے مجھے خدا مان لیا تھا حالانکہ جو چیز غروب ہو جائے

اور جسے زوال آئے وہ کیوں کر خدا ہو سکتا ہے؟

3۔ رات: جب میں آتی ہوں تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ لوگ مصنوعی بلب جلا کر کام کاج نمٹاتے ہیں اور آپ اپنا ہوم ورک مکمل کرتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے حساب سے پہلے میں آتی ہوں۔ مجھے اللہ نے اس لیے بنایا کہ میرے آنے پر سب لوگ آرام کریں اور میٹھی نیند سو جائیں۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّ ھٰذَا اِقْبَالُ لَیْلِکَ وَاِدْبَارُ نَھَارِکَ وَاَصْوَاتُ دُعَاتِکَ فَاغْفِرْلِیْ۔

''اے اللہ! یہ رات کے آنے کا وقت اور دن کے رخصت ہونے کا وقت اور تیرے داعی کی آواز ہے، بس مجھے بخش دے۔'' میرے ختم ہوتے ہی میرا بھائی ''دن'' آ جاتا ہے۔

4۔ دن: ہمارے آتے ہی ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیل جاتی ہے۔ سارا جہان روشن ہو جاتا ہے۔ لوگ کام کاج میں مگن ہو جاتے ہیں۔ کسان کھیتوں پر چلے جاتے ہیں۔ دکان دار اور تاجر دکان کا رخ کرتے ہیں اور بچے اسکول کی طرف تعلیم حاصل کرنے کے لیے رواں دواں ہوتے ہیں۔

میں جہان کو روشن کرتا ہوں اور سورج کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ طاقت بخشی ہے تو بتائیے وہ اللہ کتنا بڑا ہو گا جو رات کا سخت اندھیرا ختم کر کے مجھے لاتا ہے تو سب کہہ دیجئے **اَللّٰہُ اَکْبَرُ** ''اللہ سب سے بڑا ہے۔''

5۔ پہاڑ: میں وہ ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پانی پر بچھایا تو وہ ڈول رہی تھی، جیسے ایک پانی سے بھری بالٹی میں کوئی برتن ڈالیں تو وہ کیسے ڈولے گا۔ اسی طرح زمین، پانی پر ڈول رہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے زمین کو ڈولنے سے بچانے کے لیے مجھے بنایا۔

مجھے زمین کے لیے کیل بھی کہا جا سکتا ہے۔ میں کروڑوں کی تعداد میں زمین بھر میں پھیلا ہوا ہوں۔ کہیں میرے اوپر برف ہی برف ہے اور میں برف سے ڈھکا ہوا ہوں۔ کئی جگہ میرے اوپر سرسبز و شاداب جنگلات ہیں، کئی جگہ میں صرف پتھروں کی صورت میں ہوں۔ کئی جگہ میرا رنگ لال ہے اور کئی ایک جگہ کالا، سبز اور کئی ایک جگہ۔ جہاں برف ہی برف ہے وہاں چاندی کی طرح چمکتا ہوا سفید ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے زمین پر حسن ہی حسن پیدا کر دیا ہے۔ میں ہزاروں میل طویل بھی ہوں۔ مجھے دیکھ کر چھوٹے سے انسان پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اب یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ میں اتنا بڑا ہوں تو جس نے مجھے بنایا وہ کتنا بڑا ہو گا۔

6۔ پانی: زمین کتنی بڑی ہے لیکن میں نے ساری زمین کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ بڑے بڑے ٹھاٹھیں مارتے سمندر، روانی سے بہتے دریا، نہریں...... میرے ہی دم سے تو قائم ہیں۔

فرعون نے جو بڑائی اور خدائی کا دعویٰ کیا، اس کے غرور کو اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے سے توڑا۔ میں نے اسے خوب غوطے کھلائے۔ اس کے غرور کو خوب اپنے تہہ میں موجود خاک سے ملا دیا۔ بالآخر وہ مجھ میں غرق ہو گیا اور پھر میں نے اسے دنیا والوں کی عبرت کے لیے کنارے پر پھینک دیا۔

میرے طوفان کے سامنے دنیا کے بنائے ہوئے بند نہیں ٹھہر سکتے۔ جس مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے بنایا اگر اس کی بڑائی کو چھوڑ کر کوئی اپنے آپ کو بڑا کہے اور غرور اور تکبر کرے تو مجھ پر بنا ہوا سمندر بے لگام ہونے کی کوشش کرتا ہے کہ ان کو نگل جاؤں مگر اس بڑائی والے اللہ تعالیٰ نے مجھے لگام دے دی۔

پیارے بچو! مجھے پی کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا تو نہیں بھول گے؟ مجھے پینے سے پہلے اللہ کا نام لینا اور پی کر الحمد للہ کہنا یاد رہے گا نا......!!

تکبر کا انجام

نوفل بن مساحقؒ کہتے ہیں: نجران کی مسجد میں، میں نے ایک نوجوان کو دیکھا جو بڑا خوب صورت، لمبا چوڑا، جوانی کے نشے میں چور تھا۔ میں نگاہیں جما کر اس کے جمال و کمال کو دیکھنے لگا۔ اس نے پوچھا: ''کیا دیکھ رہے ہو؟''

میں نے کہا: ''مجھے آپ کے حسن و جمال پر تعجب ہو رہا ہے۔''

اس نے جواب دیا جو تکبر ہی تکبر تھا۔ کہنے لگا: صرف تجھے ہی نہیں، خود اللہ کو بھی تعجب ہو رہا ہے (نعوذ باللہ)۔

نوفلؒ کہتے ہیں: یہ کفریہ کلمہ کہتے ہی وہ سکڑنے لگا۔ اس کا رنگ و روپ اڑ گیا، یہاں تک کہ اس کا قد ایک بالشت رہ گیا۔ لوگ حیران رہ گئے، آخر اس کا ایک رشتہ دار اسے اپنی آستین میں ڈال کر لے گیا۔

☆☆☆

اُستاد جی

قراۃ العین خرم ہاشمی

''عبدالرافع......'' اُستاد عبدالقادر نے اپنی سخت نگاہوں سے اسے گھورا اور تنبیہی لہجے میں پکارا۔ ان کے سرخ و سفید چہرے پر غصے کی لالی الگ سے نظر آ رہی تھی۔ دھوتی اور اس کے اوپر سفید کرتہ، جس پر سفیدی دھاگے سے کڑھائی ہوئی تھی، ان کا مخصوص حلیہ تھا۔

اُستاد عبدالقادر اپنے غصے اور اصول پسندی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ انہوں نے بچوں کو کبھی مارا نہیں تھا مگر ان کا رعب و دبدبہ اور خوف ہی بچوں کے لیے کافی ہوتا تھا۔

عبدالرافع کی تو اُستاد عبدالقادر سے جان جاتی تھی مگر اس کی اماں بتول بی بی، اپنے ہر چھوٹے بڑے مسئلے کے لیے اُستاد عبدالقادر کے پاس ہی دوڑی چلی جاتی تھیں کیوں کہ اُستاد جی ان کے منہ بولے بھائی بنے ہوئے تھے اور بیوہ بتول بی بی کے اکلوتے، ضدی اور لاڈلے بیٹے کو لگام صرف اُستاد عبدالقادر ہی ڈال سکتے تھے۔

اُستاد عبدالقادر جو پورے گاؤں میں ''اُستاد جی'' کے نام سے پکارے جاتے تھے، وہ اپنے سب طالب علموں پر خصوصی نظر رکھتے تھے اور اسکول کی اچھی سے اچھی کارکردگی کے لیے دن رات محنت کرتے تھے۔

عبدالرافع ایک دم نیند سے بیدار ہو کر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے۔ اسے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے اس نے ابھی ابھی اُستاد جی کو حقیقت میں دیکھا ہے۔ اسے یاد ہے کہ اسکول کے زمانے میں اُستاد جی نے جب بھی اسے کسی چیز سے منع کرنا ہو یا تنبیہہ کرنی ہو، وہ اپنی مخصوص رعب و دبدبہ والی آواز میں صرف اتنا کہتے تھے۔

''عبدالرافع......'' اور آگے کی بات وہ خود سمجھ جاتا تھا۔ آج اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی، اب جب کہ وہ عملی زندگی میں قدم رکھ چکا تھا۔ اس کے ذہن میں بیٹھا، وہ ڈر اور خوف آج بھی اسی دن کی طرح قائم تھا۔

عبدالرافع نے اُٹھ کر ٹھنڈا پانی پیا اور اس کے حواس بحال ہوئے اور بستر پر لیٹ کر دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا مگر آج کل وہ عجیب سی کشمکش کا شکار تھا۔ وہ صحیح اور غلط کے درمیان فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ جب بھی ایسا ہوتا، وہ اپنے اُستاد جی کو ضرور خواب میں دیکھتا تھا اور اس کے بعد اسے کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور فیصلہ خود بخود ہو جاتا تھا۔

وہ اس بات کا برملا اعتراف کرتا تھا کہ آج بھی وہ اپنے بچپن کے اس ڈر سے نہیں نکلا تھا، جو اس کی ماں نے اُستاد جی کا اس کے دل میں بٹھا دیا تھا۔ نجانے یہ مائیں بھی کیوں اپنے بچوں کو کسی نہ کسی

چیز سے ڈرانا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ کیا ڈرائے بغیر بچوں کی پرورش ٹھیک سے نہیں کی جاسکتی ہے؟

عبدالرافع اکثر جھنجلا کر ایسی باتیں سوچتا تھا مگر کوئی بھی جواب نہیں ملتا تھا۔ عبدالرافع جب آفس پہنچا تو ایک فیصلہ کر چکا تھا اور اس پر مطمئن بھی تھا۔ عبدالرافع محکمہ تعلیم میں کام کرتا تھا اور اس کی پوسٹ ایسی تھی جہاں اکثر و بیشتر بہت سے لوگ اسے دو نمبر کام کرنے کو کہتے تھے اور بدلے میں اسے کافی پرکشش رقم کی پیش کش بھی کی جاتی تھی۔ اسے یہاں کام کرتے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے فی الحال وہ یہاں کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اپنے آس پاس رشوت کا بازار لگا دیکھ کر وہ اکثر دکھ کا شکار ہو جاتا تھا۔ اس نے اب تک تو خود کو، ان تمام برائیوں سے بچا کر رکھا ہوا تھا مگر آخر کب تک......!!

عبدالرافع نے ملک کی سب سے بڑی اور مشہور یونی ورسٹی میں مزید تعلیم کے لیے درخواست دی اور خوش قسمتی سے وہ منتخب بھی ہو گیا تھا مگر اصل مسئلہ یہ تھا کہ اس کے پاس اس کورس کے لیے جمع شدہ رقم کچھ کم پڑ گئی تھی۔ عبدالرافع اس سنہری موقعے کو کھونا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے پاس مطلوبہ رقم بھی پوری نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا کوئی ایسا دوست بھی نہیں تھا کہ جس سے وہ اتنی بڑی رقم ادھار مانگتا۔

ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے کہ اس کے پاس ایک آدمی آیا جو امتحان میں اپنے بیٹے کو پاس کروانے کے لیے جعلی نمبر لگوانا چاہتا تھا۔ وہ شخص، بہت بڑا زمین دار تھا اور اس نے اس کام کے عوض عبدالرافع کو ایک لاکھ روپے کی پیش کش کی تھی۔ عبدالرافع کی جمع شدہ رقم میں صرف تیس ہزار کم پڑ رہے تھے۔ فیس جمع کروانے کے لیے ایک لاکھ کی رقم، اس کے لیے بہت بڑی تھی کیوں کہ اس نے ساری زندگی روپیہ روپیہ کر کے جوڑا تھا۔ عبدالرافع کے لیے یہ کام کرنا بہت آسان تھا۔ وہ بہت آسانی سے اس لڑکے کے نمبر لگوا سکتا تھا۔ یونی ورسٹی میں فیس جمع کروانے میں صرف دو دن رہ گئے تھے۔

اسی الجھن میں عبدالرافع کا ایمان لمحہ بھر کے لیے ڈگمگا گیا تھا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس شخص کی پیش کش کو قبول کر لے گا۔

"ایک بار میرا مستقبل محفوظ ہو جائے پھر دوبارہ ایسا کوئی کام نہیں کروں گا۔" عبدالرافع نے دل ہی دل میں فیصلہ کرتے ہوئے خود سے کہا اور اسی رات، اس نے خواب میں اُستاد جی کو سخت ناراض اور غصے میں اسے گھورتے ہوئے دیکھا۔ عبدالرافع ڈر کے اٹھ گیا اور اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا۔ جب صبح وہ شخص اس کے پاس آفس پہنچا تو عبدالرافع نے دوٹوک انداز میں، اس کا کام نہ کرنے سے معذرت کر لی۔

"تم غلطی کر رہے ہو! ہماری پیش کش کو ٹھکرا کے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ اگر یہ کام تم نہیں کرو گے تو کیا ہوگا؟ میں کسی اور سے کروا لوں گا۔ تم جیسے دو ٹکے کے لوگوں کی حیثیت ہی کیا ہے ہمارے سامنے۔" اس شخص نے اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

"فی الحال تو آپ اسی دو ٹکے کے آدمی کے سامنے جھولی پھیلائے کھڑے ہیں۔ آپ نے جس سے جو کام کروانا ہے، کروا لیں مگر میں ایسا کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔" عبدالرافع نے سختی سے کہا تو وہ شخص غصے میں پاؤں پٹختا، بکتا ہوا آفس سے باہر نکل گیا۔

"یار! پاگل ہو......! تم بھی کن لوگوں سے پنگا لے رہے ہو۔ ایک چھوٹا سا کام تو تھا کر دیتے۔ تمہیں فائدہ ہی ہونا تھا۔" اس کے دوست ذیشان نے پاس آ کر کہا۔

"یار! میں اپنے فائدے کے لیے دوسروں کا جائز حق نہیں مار سکتا۔ میری ماں نے بیوگی میں بھی مجھے 'حلال' کا لقمہ کھلایا ہے۔ اب میں اس عمر میں آ کر ان کی محنت پر پانی پھیر کر، 'حرام' کی طرف نہیں جا سکتا۔" عبدالرافع نے سنجیدگی سے کہا تو ذیشان اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔

عبدالرافع کا دل بہت اداس اور بے قرار سا تھا۔ ایک تو لوگوں کے تلخ رویے اور باتیں اور دوسرا اپنی سب سے بڑی خواہش کے پورا نہ ہونے کے دکھ نے اس کی طبیعت بوجھل کر دی تھی۔ اس نے کتنے عرصے سے، اس یونی ورسٹی میں پڑھنے کے لیے، پیسے جمع کرنے شروع کیے تھے۔

"مگر شاید غریبوں کو، کوئی حق نہیں ہوتا اونچے اونچے خواب دیکھنے کا۔" عبدالرافع نے افسردگی سے سوچا اور دوپہر کی بس پر سوار ہو کر اپنے گاؤں چلا گیا۔ عبدالرافع نے جس وقت گاؤں کی سرزمین پر قدم رکھا، اس وقت عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ اس نے قریبی مسجد میں نماز پڑھی اور بلا ارادہ اس کے قدم 'اُستاد جی' کے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔

اُستاد جی اپنے گھر کے بڑے سے برآمدے میں چارپائی پر نیم دراز گاؤں کے بچوں کو پڑھا رہے تھے۔ شام کے وقت گاؤں کے اکثر بچے ان کے پاس پڑھنے کے لیے آجاتے تھے۔ ویسے تو انہیں ریٹائرڈ ہوئے کافی سال ہو چکے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ کافی بوڑھے بھی ہو چکے تھے مگر آج بھی چاک و چوبند تھے۔ وہ آج بھی اپنے مخصوص حلیے میں تھے۔

سفید کرتے اور دھوتی پہنے، ایک ہاتھ سے حقہ پیتے، وہ بچوں کو پڑھا رہے تھے۔ عبدالرافع نے پاس آ کر دھیرے سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام...... کیسے ہو عبدالرافع؟" اُستاد جی اسے دیکھ کر مسکرائے اور اپنے سامنے پڑے موڑھے پر بیٹھنے کو کہا۔

"کیا بات ہے، پریشان ہو؟" اُستاد جی نے ایک بچے کی کاپی کو چیک کرتے ہوئے سوال کیا تو عبدالرافع نے چونک کر ان کی طرف دیکھا جن کی ساری توجہ بچوں کی طرف تھی۔

"اُستاد جی کو کیسے پتا چلا؟" عبدالرافع نے سوچتے ہوئے خود سے کہا۔ اسی وقت اُستاد جی نے سب بچوں کو چھٹی دے دی اور عبدالرافع کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"تم حیران ہو رہے ہو کہ مجھے کیسے پتا چلا؟ بے وقوف جب تم چھوٹے سے تھے، تب سے میرے پاس آ رہے ہو۔ میں تمہیں، تم سے بھی بہتر جانتا ہوں۔ اس لیے کہ میں تمہارا روحانی اُستاد ہوں۔"

اُستاد جی نے عبدالرافع کے دل میں مچلتے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تو عبدالرافع شرمندہ ہو گیا۔

"اب بولو، کیا مسئلہ ہے؟" اُستاد جی نے سختی سے پوچھا تو عبدالرافع نے بغیر رُکے، انہیں سب کچھ بتا دیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اُستاد جی کو سبق سنا رہا ہو۔ اُستاد جی اس کے انداز پر دھیرے سے مسکرا دیے مگر پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو کر اس کی بات سننے لگے۔

"ہاں...... تو میں کون سا تمہیں دیکھ رہا تھا، تم مان لیتے اس کی بات اور اپنے مستقبل کو محفوظ کر لیتے۔" اُستاد جی نے لاپروائی سے کہا تو عبدالرافع چڑ کر بولا۔

"اُستادِ محترم! بچپن سے ہی آپ کا ڈر اور خوف اس بُری طرح دل میں بیٹھا ہے کہ آپ دُور ہو کر بھی قریب محسوس ہوتے ہیں۔ آپ کے اور اماں کے پڑھائے اور سکھائے، اچھائی، برائی کے سبق میں چاہ کر بھی نہیں بھول سکتا۔"

"عبدالرافع! وہ ڈر بہت اچھا ہوتا ہے جو آپ کی انگلی پکڑ کر آپ کو ہمیشہ سیدھے راستے پر چلاتا ہے اور بھٹکنے نہیں دیتا ہے......!! مجھے خوشی ہے کہ تم نے میرے پڑھائے اور سکھائے ہوئے علم کی لاج رکھی ہے ورنہ قیامت کے دن اُستاد عبدالقادر، اپنے رب کو کیا منہ دکھاتا کہ تو اپنے طالب علموں کو سیدھی راہ پر نہیں چلا سکا۔ تم نے مجھے دُنیا کی نظروں میں اور اس رب کے سامنے سرخرو کر دیا ہے۔ آج میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ عبدالرافع میرا شاگرد ہے۔" اُستاد جی نے اپنا سینہ فخر سے ٹھونکتے ہوئے کہا تو اپنے الفاظ پر عبدالرافع جھینپ سا گیا۔

"میں نے کیا کیا ہے! یہ سب تو بچپن سے آپ کا سکھایا اور پڑھایا ہوا تھا جو ڈر کی صورت میں میرے اندر ہمیشہ رہا ہے۔ اسی نے ہمیشہ میری مدد کی ہے اور مجھے سیدھی راہ سے بھٹکنے سے بچایا ہے۔" عبدالرافع نے عقیدت سے اپنے اُستادِ محترم کے ہاتھ چومے۔ "میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے آپ جیسے قابل اُستادِ محترم کا سایہ ملا۔" عبدالرافع نے کہا اور جھک کر انہیں سلام کرتا واپسی کے لیے مڑ گیا۔

"عبدالرافع......" اپنی پشت پر اُستاد عبدالقادر کی وہی سخت اور

رعب دار آواز سنی تو گہری سانس لیتا ہوا وہ مڑ کر انہیں دیکھنے لگا اور چونک کر حیران رہ گیا۔ استاد عبدالقادر اپنی جگہ پر کھڑے دونوں ہاتھ اس کی طرف پھیلائے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نمی اور چہرے پر فخریہ مسکراہٹ تھی۔ عبدالرافع دوڑ کر ان کے گلے سے لگ گیا اور اپنے مضبوط و توانا بازوؤں میں، ان کے کمزور وجود کو بھر لیا۔

عبدالرافع کو آج سمجھ میں آیا تھا کہ اُستاد کی سختی اور ڈانٹ میں ان بچوں کا ہی بھلا چھپا ہوتا ہے۔ عبدالرافع نے گاؤں کے اسکول سے دسویں تک، اُستاد عبدالقادر کی زیرِ نگرانی ہی پڑھا تھا اور ان کی محنت اور توجہ کی وجہ سے اس کے نمبر اتنے اچھے آئے تھے کہ اسے شہر جا کر اچھے کالج میں داخلہ ملا تھا اور یہ کامیابی کا سفر آگے سے آگے چلتا ہی گیا تھا۔ آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ اپنے اُستاد کی سختی نے ہی اسے زندگی میں کامیابی و کامرانی بخشی تھی۔ عبدالرافع، اُستاد جی سے مل کر واپس آتے ہوئے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

عبدالرافع، پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا تو صحن میں مرغیوں کو دانہ ڈالتی، اس کی ماں لپک کر اس کے پاس آئی اور پیار سے اس کا ماتھا چومنے لگی۔ ''آ گیا میرا لال...... آج میں نے اپنے پتر کی پسند کا کھانا بنایا ہے۔ نجانے کیوں آج میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ تو ضرور آئے گا۔'' ماں کی بات سن کر عبدالرافع زور سے ہنس پڑا۔ کھانا کھا کر عبدالرافع، فارغ ہوا تو اس کی اماں اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''یہ کیا ہے اماں؟'' اماں نے پوٹلی اس کی طرف بڑھائی تو عبدالرافع نے الجھن بھرے انداز میں ماں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پتر میں نے تیرے لیے کمیٹی ڈالی ہوئی تھی کہ تو اپنے لیے بائیک خرید لے۔ خیر سے آج ہی ملی ہے مجھے پورے پچاس ہزار ہیں، تو سنبھال لے۔'' اماں نے مسکراتے ہوئے کہا تو عبدالرافع حیرت اور خوشی سے ماں سے لپٹ گیا۔

''جھلا نہ ہو تو......'' اماں نے ہنستے ہوئے پیار سے عبدالرافع کے سر پر چپت لگائی۔ واپسی کے سفر میں عبدالرافع کے قدم مضبوطی اور یقین سے زمین پر پڑ رہے تھے۔

آج اس کا یقین مزید مضبوط ہو گیا تھا کہ سچی نیت رکھنے والوں کو اللہ کبھی بھی مایوس نہیں کرتا ہے اور اللہ کی رحمت سے، آج اس کا ایمان بھی سلامت رہ گیا تھا اور اس کا خواب بھی پورا ہو گیا تھا۔

اللہ کی رحمت زمین پر اُستاد عبدالقادر کی صورت میں اسے ہمیشہ ملتی رہی تھی اور اُستاد جی کے ڈر نے ہی اسے کبھی بھٹکنے نہیں دیا تھا۔ آج وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ ڈر کتنا اہم ہوتا ہے جو ہماری بھلائی کے لیے ہو......!!!

☆......☆......☆

سلسلہ ''کھوج لگائیے'' میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

اریج عزیز الرحمن، اقراء منور، گوجرانوالہ۔ حافظ محمد اورنگ زیب، لاہور۔ رانا محمد حارث، اسلام آباد۔ حیدر علی رانا، کوٹ مومن۔ محمد شعیب انور، واہ کینٹ۔ اعتصام اللہ، گوجرانوالہ۔ حسین احمد ورک، راولپنڈی۔ صفی الرحمن، لاہور۔ نمرہ رمضان، شاہ کوٹ۔ عبید اکرم شریف صدیقی، ہرنولی۔ محمد مجیر خان، بھکر۔ راحمہ رانا، ایمن آباد۔ محمد حارث جنڈ، اٹک۔ محمد ابراہیم، مطیع الرحمن، کشف طاہر، لاہور۔ محمد حسنین معاویہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ ردا نور، فیصل آباد۔ حفصہ اعجاز، بازہ ہملٹ۔ جواد الحسن، لاہور۔ تسنیم عبدالمجید، راجہ جنگ۔ عبداللہ انعام، گجرات۔ اورنگ زیب، جڑانوالہ۔ احمد نسیم ملک، نوید وقاص، علینہ حسین، عابد رحمن، محمد حمزہ مقصود، لاہور۔ نمرہ لاریب، کوہاٹ۔ محمد بلال، فیصل آباد۔ عبدالجبار الیاس، شہزادی خدیجہ شفیق، عائشہ تبسم، عبداللہ شعیب، لاہور۔ خدیجہ نشان، کاموکی۔ رجب علی مغل، ڈیرہ اسماعیل خان۔ رابیکا شاہد شیخ، گوجرانوالہ۔ زین احمد قریشی، ننکانہ صاحب۔ مرزا محمد حمزہ، اسلام آباد۔ اجمل رزاق، شیخوپورہ۔ محمد ریان طیب، راولپنڈی۔ شمیم عالم، اوکاڑہ۔ عزیر احمد، شیدو۔ مہر اکرم، محمد حمزہ، رامین حبیب، سید محمد علی حسن، فاطمہ ولی خان، لاہور۔ مشعل احمد، کھاریاں۔ بشریٰ رانا، شیخوپورہ۔ تسنیم عبدالمجید، راجہ جنگ۔ اسد امین، گوجرانوالہ۔ عاصم اقبال، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد احمد خان غوری، بہاولپور۔ احمد عامر، فیصل آباد۔ حماد حسن، ننکانہ صاحب۔ حافظ محمد منیب، وزیر آباد۔ شیزہ جاوید، گوجرانوالہ۔ فضہ کیانی، ضحیٰ بدر، عبداللہ عارف کلیم، حمزہ عدنان، زویا شاہد، نور العین، لاہور۔ خدیجہ فہد، عنایہ فہد، گوجرانوالہ۔ تطہیر زارا، میرپور آزاد کشمیر۔ سرمد عزیز، تربیلا۔ محمد طاہر حسن، لاہور۔ محمد حارث سعید، بورے والا۔ ام کلثوم قربان علی، لاہور۔ صدام حسین قادری، محمد معین الدین قادری، محمد اسد اللہ عبداللہ قادری، حسن رضا سردار قادری، محمد عمر عطاء قادری، محمد نعمان قادری، محمد صائم نواز قادری، نور فاطمہ قادری، محمد مظہر اکرم قادری، کاموکی۔ ☆☆

کھیل دس منٹ کا

ب	س	ع	د	ن	ا	چ	ر	ت	خ
ن	ژ	ص	ط	ف	ق	ے	غ	ن	و
د	ٹ	ک	ش	م	ع	م	و	م	ص
ح	ی	چ	و	ث	ف	ج	ن	پ	ش
م	ف	ش	ا	ع	ر	ش	گ	ح	ک
س	ہ	ل	ح	ڑ	ا	ذ	ج	ل	و
ل	ق	ا	ر	ف	ظ	ٹ	ق	گ	ہ
م	غ	ض	ب	ا	ن	س	ا	ن	ٹ
ط	پ	ک	ع	و	ص	ا	ل	ج	گ
ڈ	ے	ز	چ	ت	ظ	م	ا	ی	پ

آپ نے حروف ملا کر علامہ اقبالؒ کی دس نظموں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

شمع، جگنو، پیام، فراق، شاعر، شکوہ، چاند، انسان، مسلم، وصال

ایک دفعہ مولانا آزاد سے نہرو نے پوچھا: ''جب میں سر کے بل کھڑا ہوتا ہوں تو خون سر کی طرف جمع ہو جاتا ہے مگر جب پاؤں کے بل کھڑا ہوتا ہوں تو ایسا کیوں نہیں ہوتا؟''

مولانا نے جواب دیا: ''جو چیز خالی ہوگی خون اسی کی طرف جائے گا۔''

(محمد عزیر چشتی، ڈیرہ غازی خان)

ماں ماہرِ نفسیات کو بتا رہی تھی: ''میرا چھوٹا بیٹا اپنے بہن بھائیوں اور محلے کے بچوں سے خوف زدہ رہتا ہے، اسکول کے بچوں کی کتابوں اور کاپیوں پر اپنا نام لکھ دیتا ہے، کھانا بھی سب سے الگ کھاتا ہے اور تیز ہوا چلے تو پلنگ کے نیچے چھپ جاتا ہے۔''

''فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' ماہر نفسیات نے کہا۔ ''آپ کے بیٹے میں ایک اچھا لیڈر بننے کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں۔''

(احمد حسین چشتی، ڈیرہ غازی خان)

بیوی (خاوند سے): ''آج دیر سے کیوں آئے؟''

خاوند: ''دفتر میں کام زیادہ تھا، سارا دن ٹیلی فون پر بیٹھا رہا۔''

بیوی (حیران ہو کر): ''کیا دفتر میں کرسی نہیں تھی؟''

(حرا سعید شاہ، جوہر آباد)

ادریس: ''آج ایک دوست نے میری بڑی بے عزتی کی۔''

حنیف: ''وہ کیسے؟''

ادریس: ''وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ تمہیں گانا آتا ہے؟''

حنیف: ''اس میں بے عزتی کی کیا بات ہے؟ بالکل سیدھی سی بات پوچھی تھی اس نے۔''

ادریس: ''لیکن اس نے کافی دیر تک میرا گانا سننے کے بعد یہ سوال کیا تھا۔''

(ثروت یعقوب، لاہور)

فقیر (ایک گھر کے دروازے پر صدا لگائی):

''ہے کوئی اللہ کا بندہ جو مجھے کھانا کھلائے؟''

اندر سے آواز آئی: ''بابا جی! کل کا کھانا چلے گا۔''

فقیر نے کہا: ''جی، چلے گا۔''

اندر سے آواز آئی: ''تو پھر کل آنا۔''

(محمد ظہیر احمد ظہوری، کاموکی)

سائنس پروفیسر (اپنے شاگرد سے): ''یہ بتاؤ کہ اگر سونے کو کھلی ہوا میں رکھ دیا جائے تو کیا ہوگا؟''

شاگرد: ''سیدھی سی بات ہے جناب! چوری۔''

(محمد افضل انصاری، چوہنگ ٹی)

باپ (بیٹے سے): ''تم اسکول جانا پسند کرو گے؟''

بیٹا: ''جی ہاں! جانا پسند کروں گا اور آنا بھی پسند کروں گا، مگر وہاں ٹھہرنا بالکل پسند نہیں کروں گا۔''

(جواد اعجاز، صوابی)

فلم ڈائریکٹر: ''دیکھو، تم اپنا ٹیلی فون نمبر مجھے نوٹ کرا دو، میں تمہیں ایک بوڑھے کا کردار ادا کرنے کے لیے بلاؤں گا۔''

نوجوان: ''میں جوان ہوں، یہ رول کیسے ادا کروں گا؟''

فلم ڈائریکٹر: ''گھبراؤ نہیں میں تمہیں جس وقت بلاؤں گا، اس وقت تک تم بوڑھے ہو جاؤ گے۔''

(محمد حارث سعید، بورے والا)

شوہر (بیگم سے): ''ہمارے بیٹے نے لال بیگ کھا لیا ہے۔''

بیوی (چلاتے ہوئے): ''اُف خدایا! جاؤ جلدی سے ڈاکٹر کو بلاؤ۔''

شوہر: ''فکر مت کرو، میں نے اسے کیڑے مار دوا پلا دی ہے۔''

(حافظ محمد فرخ حیات، پیر محل)

بچہ اسکول سے واپسی پر دھوپ میں کھڑا ہو گیا۔ ماں نے پوچھا: ''بیٹے دھوپ میں کیوں کھڑے ہو؟''

بچہ: ''دھوپ میں کھڑا ہو کر پسینہ سوکھا رہا ہوں۔''

(حرا ظفر، گوجرانوالہ)

عباسیوں کے عہد خلافت میں مسلمان افریقہ اور ایشیاء میں بہت بڑی طاقت بن گئے تھے۔ مسلمانوں کی تہذیب و ترقی نے ساری دنیا کو حیران کر دیا تھا۔ قسطنطنیہ کے رومی دربار میں ایک مجلس قائم کر کے اس میں غور کیا گیا کہ مسلمانوں کی طاقت و ترقی کا اصل راز معلوم کیا جائے۔

بات چیت کے بعد طے پایا کہ چند ہوشیار اور قابل آدمیوں کو مسلمانوں کے شہروں میں بھیجا جائے، وہ حالات کا جائزہ لے کر رومی دربار میں اپنی رپورٹ پیش کریں۔ چنانچہ لائق افراد سوداگروں کے بھیس میں مسلمانوں کے شہروں کو چل پڑے۔ واپسی پر قیصر روم اور وفد کے سربراہ کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

قیصر روم: اپنے سفر کی روداد بیان کرو۔

رومی سربراہ: جناب والا! سب سے پہلے میں دمشق میں کپڑوں کے تاجر کا بھیس بدل کر داخل ہوا، میرے ساتھ میرا وفادار غلام بھی تھا جس کی ماتحتی میں میرے دوسرے خادم و غلام تھے۔ دمشق میں ہم نے مسلمان تاجروں کے ساتھ لین دین کیا اور ہر طرح سے انہیں پرکھا۔

قیصر روم: لین دین کے معاملے میں تم نے مسلمانوں کو کیسا پایا؟

رومی سربراہ: مسلمان تاجر لین دین میں کھرے اور بات کے پکے تھے۔ تجارت میں دیانت داری ان کا اصول ہے لیکن میں نے اس بات کو اتنی اہمیت نہیں دی۔

قیصر روم: مگر کیوں؟

رومی سربراہ: تجارت کا اصول ہی دیانت داری ہے۔ کاروبار دیانت سے پھلتا پھولتا ہے۔ دنیا کا ہر اچھا تاجر اس اصول کو جان کر ایمان داری کو بہترین پالیسی کے طور پر اختیار کرتا ہے۔ اس میں مسلمان اور عیسائی کی قید نہیں، اس لیے میں نے تجارت میں مسلمانوں کی دیانت داری کو اہمیت دیے بغیر ان کی ترقی کے راز کی تلاش میں آگے بڑھا۔

قیصر روم: آگے کہاں؟

رومی سربراہ: دمشق سے میں بغداد آ گیا۔

قیصر روم: وہاں کیا دیکھا؟

رومی سربراہ: بغداد میں مسلمانوں سے ملا۔ وہاں کے کتب خانے دیکھے، ان کے علمی اور سائنسی کارناموں کا مطالعہ کیا لیکن جواب نہ ملا کہ اسلام کے اتنی تیزی سے پھیلنے اور عوام میں اتنا زیادہ مقبول ہونے کا کیا راز ہے؟

قیصر روم: کیا مسلمانوں کی علمی و سائنسی ترقی اس سوال کا مناسب جواب نہیں؟

رومی: میرے خیال میں نہیں۔

قیصر روم: کیوں؟

رومی: اس لیے کہ علمی و سائنسی ترقی سے عوام کی زندگی پر براہ راست اثر نہیں پڑتا۔ علمی و سائنسی ترقی سے ملک فتح کیے جا سکتے ہیں مگر دلوں کو فتح نہیں کیا جا سکتا۔ میں اصل مقصد کی تلاش میں اور آگے بڑھا، یہاں تک کہ مسلمانوں کے سرحدی شہر حمص تک پہنچ گیا۔

میں نے اپنا باقی ماندہ سامانِ تجارت ایک مسلمان تاجر کے ہاتھ فروخت کیا۔ اس شہر میں خوب گھوما پھرا۔ ان کی عبادت گاہیں دیکھیں، میلے گھومے اور تہواروں کے نظارے کیے لیکن وہ راز پھر بھی حل نہ ہوا۔ مسلمانوں کے مذہب کے اس طرح پھیلنے کا سبب نہ ان کی فوجی طاقت ہے نہ تجارتی برتری، بلکہ اس کا راز کچھ اور ہی ہے جو کم از کم مجھے معلوم نہ ہو سکا۔

قیصرروم: مسلمانوں کے شہر حمص میں اور تم نے کیا دیکھا؟

رومی: ہاں! ایک واقعہ ایسا ضرور پیش آیا جس نے مجھے کافی حیران کر دیا۔

قیصرروم: وہ کیا؟

رومی: جس مسلمان تاجر کے ہاتھ میں اپنا سامانِ تجارت فروخت کیا تھا، اس نے مجھے اپنے گھر کھانے کی دعوت دی جو میں نے اس خیال سے قبول کر لی کہ دیکھیں ان کا دعوت کھلانے کا انداز کیسا ہے؟

قیصرروم: پھر تم نے ان کی مہمان نوازی کو کیسا پایا؟

رومی: مسلمان تاجر بہت مال دار تھا، اس نے بڑی شان دار ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ ساز و سامان، برتن، کھانا، یعنی ہر چیز معیاری اور اپنی قسم کی بہترین تھی لیکن میں نے اس شان و شوکت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

قیصرروم: کیوں؟

رومی: اس لیے کہ اس قسم کے عیش، دولت کی وجہ سے ہوتے ہیں جو ہم لوگ اس سے بھی زیادہ کر سکتے ہیں۔ البتہ اس دعوت میں ایک چیز میں نے ایسی ضرور دیکھی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لوگ کم از کم تہذیب کے آداب سے واقف نہیں۔

قیصرروم: وہ کیسے؟

رومی: جب میں اپنے خادموں اور غلاموں کے ساتھ اس تاجر کے ہاں گیا تو اس نے میرے علاوہ میرے غلاموں سے بھی ہاتھ ملایا اور سینے سے بھی لگایا۔ مجھے بڑا عجیب لگا بلکہ اپنی بے عزتی محسوس ہوئی کہ کہاں آقا اور کہاں غلام؟ ہر ایک کا اپنا اپنا مقام ہوتا ہے لیکن بات یہیں تک رہتی تو مجھے بُرا نہ لگتا لیکن جب اس مسلمان تاجر نے دسترخوان پر میرے غلاموں اور خادموں کو بھی میرے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہا۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں، اونچ نیچ کا لحاظ ضروری ہے۔''

قیصرروم: اچھا.....!

رومی: وہ تو شکر ہے کہ میرے غلاموں اور خادموں نے خود ہی انکار کر دیا اور بڑے ادب سے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے لیکن میری حیرت کی انتہا اس وقت نہ رہی، جب میزبان نے اپنے غلاموں کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بیٹھنے کی دعوت دی تو وہ آدابِ مجلس سے ناواقف غلام بڑی بے تکلفی سے اپنا آقا کے دائیں بائیں بیٹھ گئے اور بڑے مزے سے ہاتھ بڑھا بڑھا کر اپنے آقا کی پلیٹ میں سے کھانے لگے۔ میں حیران و پریشان یہ نظارہ دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ قدرت نے ایسے لوگوں کو عروج دے دیا ہے جو آدابِ مجلس سے بھی واقف نہیں۔ میں نے اس دعوت کے آخر میں جو کچھ دیکھا اس نے تو مجھے سکتے میں ڈال دیا۔

قیصرروم: وہ کیا بات تھی؟

رومی: میں نے دیکھا کہ مسلمان تاجر نے اپنے غلام کی کھائی ہوئی روٹی کے ٹکڑے اٹھا لیے اور یہ کہہ کر کھانے لگا کہ ہمارے پیارے آقا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رزق کو ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔ جناب والا! یہ میرے سفر کی روداد ہے۔ مجھ پر مسلمانوں کے مذہب کی مقبولیت کا راز نہ کھلنا تھا، نہ کھلا۔

قیصرروم: لیکن میں اس راز کو جان گیا ہوں؟

رومی: جناب والا! پھر آپ اس راز سے پردہ اٹھائیے؟

قیصرروم: پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا خاص غلام اور دوسرے غلام اس سفر پر تمہارے ساتھ گئے تھے، ان کا کیا حال ہے؟

رومی: جناب والا! مجھے بڑی ندامت ہے کہ ہمارے آدمیوں میں سے بیشتر بھاگ کر مسلمانوں کے علاقوں میں چلے گئے اور مسلمان ہو گئے۔ حد یہ ہے کہ میرا وفادار غلام جس پر مجھے بڑا ناز تھا، وہ بھی میرا ساتھ چھوڑ کر چلا گیا۔

قیصرروم: حمص کے مسلمان تاجر کے ہاں جو کچھ تم نے دیکھا، وہی مسلمانوں کی ترقی اور اسلام کی مقبولیت کا اصل راز ہے۔ وہ رزق کی قدر کرتے ہیں اور ان کے دین میں آقا اور غلام، امیر اور غریب، سب برابری کا درجہ اور حق رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہارے غلام تمہیں چھوڑ کر کبھی نہ بھاگتے اور نہ ہی مسلمان ہوتے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

نسرین شاہین

اسنوکر

جب پاکستان اسنوکر کے کھیل کا عالمی چیمپئن بنا۔

ہاکی، کرکٹ اور اسکواش کے بعد اسنوکر کے کھیل میں پاکستان عالمی چیمپئن بنا۔ اسنوکر کے کھلاڑی محمد یوسف نے اس کھیل میں فتح و کامرانی کی وہ داستان رقم کی جو مدتوں فراموش نہیں کی جا سکتی۔ پاکستان عالمی چیمپئن کیسے بنا؟ اسنوکر کی دُنیا میں پاکستان کا نام روشن کرنے والے محمد یوسف کی کہانی حیرت انگیز بھی ہے اور قابل رشک بھی۔

بھارت کے شہر ممبئی میں 1952ء میں پیدا ہونے والے محمد یوسف نے ممبئی میں کیرم کھیلنا شروع کیا۔ وہ اس کھیل میں ''آل ممبئی جونیئر چیمپئن'' بھی رہے۔ 1966ء میں پاکستان ہجرت کی۔ کراچی آکر کم سن یوسف نے نوکری کی تلاش کی جو ناکافی تعلیم کی وجہ سے ایک مشکل کام تھا۔ یہاں بھی کیرم کھیلنے کا مشغلہ جاری رکھا اور ڈیڑھ دو برس ہی میں کراچی کے تمام بڑے کھلاڑیوں کو شکست دے دی۔ کراچی کی ایلفنسٹن اسٹریٹ پر اخبار بیچنے شروع کر دیئے اور ایک قریبی گودام میں سو جایا کرتے تھے۔ پھر نانکواڑہ کے علاقے میں ایک چائے کے اسٹال پر نوکری مل گئی مگر یہ نوکری بھی زیادہ عرصے نہیں چلی۔ مختلف چھوٹے موٹے کام کرتے رہے۔

اسنوکر کا کھیل انہی دنوں پاکستان میں متعارف ہوا تھا۔ ایک روز محمد یوسف کراچی میں صدر کے علاقے میں غوثیہ ہوٹل کے قریب جمشید اسنوکر پارلر کے باہر کھڑے تھے۔ اسنوکر کے کھیل نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور محمد یوسف نے اپنی جیب میں موجود معمولی رقم خرچ کر کے یہ کھیل کھیلنے کی کوشش کی۔ 1972ء میں محمد یوسف لاہور چلے گئے جہاں انہیں ایک کمرشل اسنوکر کلب میں بطور مارکر نوکری مل گئی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے سولہ برس وہاں گزارے۔ اس دوران مسلسل تیرہ برس تک کیرم کے کھیل میں، آل پنجاب چیمپئن رہے۔ آمدن بڑھانے کی غرض سے ویڈیو کا کاروبار شروع کر دیا۔ ایک روز فلمیں خریدنے کے لیے کراچی آئے تو یہاں ایک اشتہار پر نظر پڑی۔

اشتہار کے مطابق اسنوکر کے کھیل کی نیشنل چیمپئن شپ کراچی کلب میں منعقد ہو رہی تھی۔ اس مقابلے میں حصہ لینے کے لیے 1985ء میں کراچی کا رخ کیا۔ 1986ء میں پیدا ہونے والی اس نیشنل چیمپئن شپ میں اس وقت کے معروف کھلاڑی لطیف امیر بخش کے ہاتھوں محمد یوسف کو شکست ہوگئی مگر موقع ملتے ہی انہوں نے 1987ء کے بعد سے نو قومی چیمپئن شپس جیت لیں۔ محمد یوسف نے پہلی بار 1987ء میں بھارت کے شہر بنگلور میں ہونے والی عالمی چیمپئن شپ میں حصہ لیا تھا۔ اس کے بعد وہ متواتر ہر سال قسمت آزمائی کرتے رہے مگر وہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ یہ کامیابی انہیں آٹھویں چیمپئن شپ میں حاصل ہوئی جب انہوں نے اپنے گروپ کے تمام میچوں میں کامیابی حاصل کرتے ہوئے اپنے لیے حتمی راؤنڈ میں شرکت کی راہ ہموار کی۔

یہ وہ وقت تھا جب ہمارے ہاں نوجوان کھلاڑیوں کا چرچا زیادہ ہونے لگا تھا اور پاکستان اسنوکر فیڈریشن کے بعض ''بڑوں''

کی نظروں میں بھی نوجوان کھلاڑی سمائے ہوئے تھے لیکن عالمی مقابلے میں محمد یوسف کا جانا طے تھا۔ اس لیے وہ مجبور تھے۔ تاہم انہیں نوجوان کھلاڑیوں کے حق میں کی جانے والی باتوں اور ان کے کھیلنے کی استعداد سے متعلق بعض لوگوں کے شبہات نے بہت بددل کر دیا تھا جس کی وجہ سے محمد یوسف خود بھی اس مقابلے کے لیے تیار نہیں تھے لہٰذا خود انہوں نے فیڈریشن کو یہ پیش کش کی کہ وہ جسے بھیجنا چاہیں بھیج دیں، وہ اس مقابلے سے الگ ہو جاتے ہیں لیکن پھر ہوا یوں کہ اسنوکر کے جس نوجوان کھلاڑی کو عالمی مقابلے میں بھیجنے کے لیے اصرار کیا جا رہا تھا، اس کی فیڈریشن کے ساتھ کھٹ پٹ ہو گئی اور پھر محمد یوسف کو ہی عالمی مقابلے میں پاکستان کی طرف سے بھیجا گیا۔ دراصل قدرت خوب جانتی ہے کہ اسے کس سے کیا کام لینا ہے اور پھر وہی اس کے لیے راستے بناتی ہے۔ اگر اس وقت محمد یوسف کو ڈراپ کر دیا جاتا تو آج یقیناً اسنوکر کھیل کی تاریخ کتنی مختلف ہوتی اور محمد یوسف کہاں ہوتے؟

یہ بات 1987ء سے 1993ء تک کی ہے اور پھر 1994ء میں عالمی مقابلے کا موقع آیا، پھر بھی بہت کم لوگوں کو یقین تھا کہ اپنے طور پر سیکھنے والا یہ جوشیلا کھلاڑی کبھی بین الاقوامی معیار پر پورا اتر سکے گا۔ کوارٹر فائنل اور سیمی فائنل میں انہوں نے پہلے کرشن اور پھر اینڈریولکس کو اعصاب شکن مقابلے کے بعد شکست سے دوچار کیا۔ عالمی اسنوکر کے فائنل میں ان کا جادو سر چڑھ کر بولا اور انہوں نے واضح برتری سے یہ میچ جیتا اور انہوں نے 1994ء میں جوہانسبرگ، جنوبی افریقہ میں ہونے والی اکیسویں عالمی چیمپئن شپ میں آئس لینڈ کے نامور کھلاڑی جوہانیز جانسن کو نو کے مقابلے میں گیارہ (11-9) فریم سے شکست دے کر پاکستان کے لیے اسنوکر عالمی چیمپئن شپ حاصل کر لی اور دُنیا کو حیران کر دیا۔ یہ وہ اعزاز ہے جو ان سے قبل کوئی بھی پاکستانی کھلاڑی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ محمد یوسف عالمی اعزاز حاصل کرنے والے پانچویں ایشیائی کھلاڑی ہیں۔ عالمی کپ کے ان مقابلوں میں 79 کھلاڑیوں نے حصہ لیا تھا۔

1994ء میں پاکستان اسنوکر کا عالمی فاتح بن گیا۔ محمد یوسف کی اس تاریخی کامیابی نے رنگ برنگی گیندوں سے کھیلے جانے والے اس کھیل میں مزید رنگ بھر دیے۔ تقریباً چار سال بعد محمد یوسف نے جوہانسبرگ میں ایک اور شان دار فتح حاصل کی جب انہوں نے اپنے کیریئر کے سخت ترین مقابلوں میں سے ایک کے دوران تھائی لینڈ کے فیروم کو 8-7 سے ہرا دیا۔ عالمی ٹائٹل، ایشین ٹائٹل اور متعدد قومی ٹورنامنٹ جیتنے کے باوجود محمد یوسف کے عزم اور حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی لیکن پھر پاکستان بلیئرڈز اینڈ اسنوکر ایسوی ایشن کے صدر علی اصغر ولیکا سے ان کے تعلقات میں کشیدگی آنے لگی اور پھر وہ وقت بھی آیا جب اس چیمپئن کو مزید کھیلنے سے روک دیا گیا۔ محمد یوسف پر یہ پابندی 1998ء کو دو سال کے لیے لگائی گئی اور سندھ ہائی کورٹ کے ذریعے اسے معطل کیے جانے کے باوجود محمد یوسف کو ملکی اور بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ نہیں لینے دیا گیا۔

محمد یوسف نے 1985ء سے باقاعدہ یہ کھیل کھیلنا شروع کیا تھا اور مسلسل چھ بار قومی اسنوکر چیمپئن شپ جیتی جبکہ چار مرتبہ لطیف ماسٹرز کے فاتح ٹھہرنے والے اسنوکر کے مایہ ناز کھلاڑی محمد یوسف گلوکاری بھی کرتے ہیں اور اپنے گانوں کی شاعری بھی خود کرتے ہیں۔ اپنے اس ہنر سے جڑا ایک واقعہ ان کے جذبہ حب الوطنی کے اظہار کے لیے کافی ہے۔ ہوا یوں کہ بھارت کی کمپنی ”ریڈ اینڈ ٹیلر“ کا بیش قیمت ملبوسات کی تیاری میں بڑا نام ہے۔ 2006ء میں امیتابھ بچن ان کے برانڈ ایمبیسیڈر تھے۔ اس زمانے میں اسنوکر کے ایک مقابلے میں شرکت کے لیے محمد یوسف کا انڈیا جانا ہوا تو وہاں ریڈ اینڈ ٹیلر، کے جنرل منیجر سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ملاقات کے دوران انہوں نے محمد یوسف سے ان کے گانے مانگے اور کہا کہ میں انڈیا میں تمہاری آواز کو پہچان بنا دوں گا، لیکن یہ محمد یوسف کا جذبہ حب الوطنی تھا کہ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت اسنوکر، عالمی چیمپئن کی حیثیت سے ان کی شناخت بن چکی تھی اور وہ بہت پُرجوش تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے فن کی تشہیر کا سلسلہ انڈیا سے شروع ہو۔ وہ ملکی سطح پر گائیکی کے شعبے کی شروعات کرنا چاہتے ہیں اور آج بھی منتظر ہیں کہ کوئی ادارہ یا شخصیت ان سے رابطہ کرے اور وہ ملکی سطح پر گلوکاری کا مظاہرہ کریں۔ 1994ء میں پاکستان اسنوکر کا عالمی چیمپئن بنا لیکن دوبارہ یہ اعزاز حاصل نہ کر سکا۔

☆☆☆

مسواک: سنت اور صحت

دورِ جدید میں نئی عمر اور نئے ذہن والے لوگوں میں برش اور ٹوتھ پیسٹ رائج ہیں۔ اس سے دُنیاوی صفائی و نظافت تو حاصل ہو جاتی ہے مگر مسواک کی سنت اور اس کا ثواب حاصل نہیں ہوتا۔ ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے سے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مسواک والی سنت ادا ہو جاتی ہے۔ یہ سوچ صحیح نہیں ہے، مسواک والی سنت مسواک سے ہی ادا ہوگی۔ اس کا ثواب مسواک کرنے سے ہی ملے گا۔ ٹوتھ پیسٹ سے نہیں اور نہ ہی اس سے سنت ادا ہوگی۔ آج کل مسواک والی سنت پر عمل بہت کم ہوگیا ہے، خاص کر شہروں میں تو اس پر توجہ دی ہی نہیں جاتی۔ مہنگی مہنگی ٹوتھ پیسٹ استعمال کی جاتی ہیں مگر مسواک نہیں، حالاں کہ عشقِ نبوی ﷺ کا تقاضا ہے کہ آپ ﷺ کی سنتوں پر بھرپور عمل کی کوشش کی جائے۔ مزید برآں محققین کی تحقیق ہے کہ جو مسلسل ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتا ہو، اگر وہ استعمال کرنا چھوڑ دے تو اس کے منہ سے بدبو آنا شروع ہو جائے گی۔ البتہ نبی کریم ﷺ کی سنت پر عمل کرنے میں جہاں دینی و روحانی فوائد ہیں، وہاں دُنیاوی اور جسمانی فوائد بھی ہیں۔ مسواک ہی کو لے لیا جائے، اس میں جہاں دینی فوائد مضمر ہیں، وہیں جسمانی فائدے بھی بے بہا ہیں۔ مثلاً جو نماز ایسے وضو کے ساتھ پڑھی جائے جس میں مسواک کیا گیا ہو اس کا ثواب ستر گنا تک بڑھ جاتا ہے۔ مسواک کے اسّی فوائد شمار کیے گئے ہیں، ان میں سے ادنیٰ ترین فائدہ یہ ہے مرتے وقت کلمہ نصیب ہوگا۔ **مسواک کی موٹائی:** مسواک کی موٹائی چھوٹی انگلی کے برابر ہو۔ (السعایہ ص118) مطلب یہ کہ ایسی ہو کہ سہولت سے چبایا جائے اور نرم ہو جائے۔ **مسواک کی لمبائی:** مسواک کی لمبائی ایک بالشت سے زیادہ نہ ہو، ورنہ اس پر شیطان سوار ہو جاتا ہے۔ ہاں! مسواک کرتے کرتے اگر وہ چھوٹا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ (السعایہ ص119)

مسواک پکڑنے کا طریقہ: مسواک پکڑنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کی خنصر (سب سے چھوٹی انگلی) کو مسواک کے نیچے رکھا جائے اور بنصر (اس کی بغل والی انگلی) اور سبابہ (شہادت والی انگلی) مسواک کے اوپر رکھی جائیں۔ انگوٹھا مسواک کے سرے کے نیچے رکھا جائے اور مسواک دائیں ہاتھ سے پکڑی جائے۔ (عمدۃ القاری ج 3 ص 175) **مسواک کرنے کا طریقہ:** مسواک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مسواک دانت کے اوپر والے حصہ اور نچلے حصہ اور تالو پر ملے اور مسواک کرنے میں دائیں جانب پہل کرے۔ پھر بائیں جانب، کم از کم تین بار اوپر کے دانتوں کو اسی طرح تین بار نیچے کے دانتوں پر مسواک ملے۔ مسواک دائیں ہاتھ سے پکڑ کر لمبائی اور چوڑائی دونوں میں کرے۔ طحطاوی میں مسواک کے بارے میں لکھا ہے کہ دانتوں کے باہر والے حصے پر گھما گھما کر کرے اور دونوں دانت کے جوڑ میں بھی کرے۔ (شامی ج 114) **مسواک رکھنے کا طریقہ:** ☆مسواک کو بچھا کر نہیں رکھنا چاہیے۔ ☆مسواک کو دھو کر رکھا جائے اور پھر دوبارہ کرتے وقت دھولیں۔ مسواک زمین پر نہ رکھیں، اس سے جنون کا اندیشہ ہے بلکہ طاق یا کسی اور اونچے مقام دیوار وغیرہ پر کھڑی رکھنی چاہیے۔ (شامی ج 1 ص 115) ☆مسواک کو مٹھی میں پکڑ کر نہیں کرنی چاہیے، اس سے بواسیر کا اندیشہ ہوتا ہے۔ (السعایہ ص199) مسواک لیٹ کر نہ کی جائے، اس سے تلی بڑھ جاتی ہے۔ (طحطاوی ص38) ☆مسواک کو چوسنا نہیں چاہیے، اس سے اندھاپن پیدا ہوتا ہے۔ ہاں! اگر مسواک نئی ہو تو پہلی مرتبہ صرف چوسا جا سکتا ہے۔ ☆پہلی مرتبہ مسواک کو چوسنا جذام اور برص کو دفع کرتا ہے۔ موت کے علاوہ تمام بیماریوں سے شفا ہے، اس کے بعد چوسنا نسیان پیدا کرتا ہے۔ (شامی ج 1 ص 155) ☆بلا اجازت دوسرے کی مسواک کرنا مکروہ ہے۔ ☆مسواک ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنی چاہیے تاکہ جہاں نماز کا وقت ہو اس سنت پر عمل کیا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سنت اور باقی تمام سنتوں پر التزام کے ساتھ عمل کی توفیق مرحمت فرمائیں، آمین ثم آمین۔

کھوج لگایئے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/ جون 2014ء ہے۔

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/ جون 2014ء ہے۔

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

جون کا موضوع چڑیا گھر ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08/ جون 2014ء ہے۔

نام ____________ عمر ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________

اوجھل خاکے
یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔
FAIRY TALES

میری زندگی کے مقاصد

قصی سجاد، راول پنڈی
میں ڈاکٹر بن کر اپنے ملک پاکستان کا نام روشن کروں گی۔
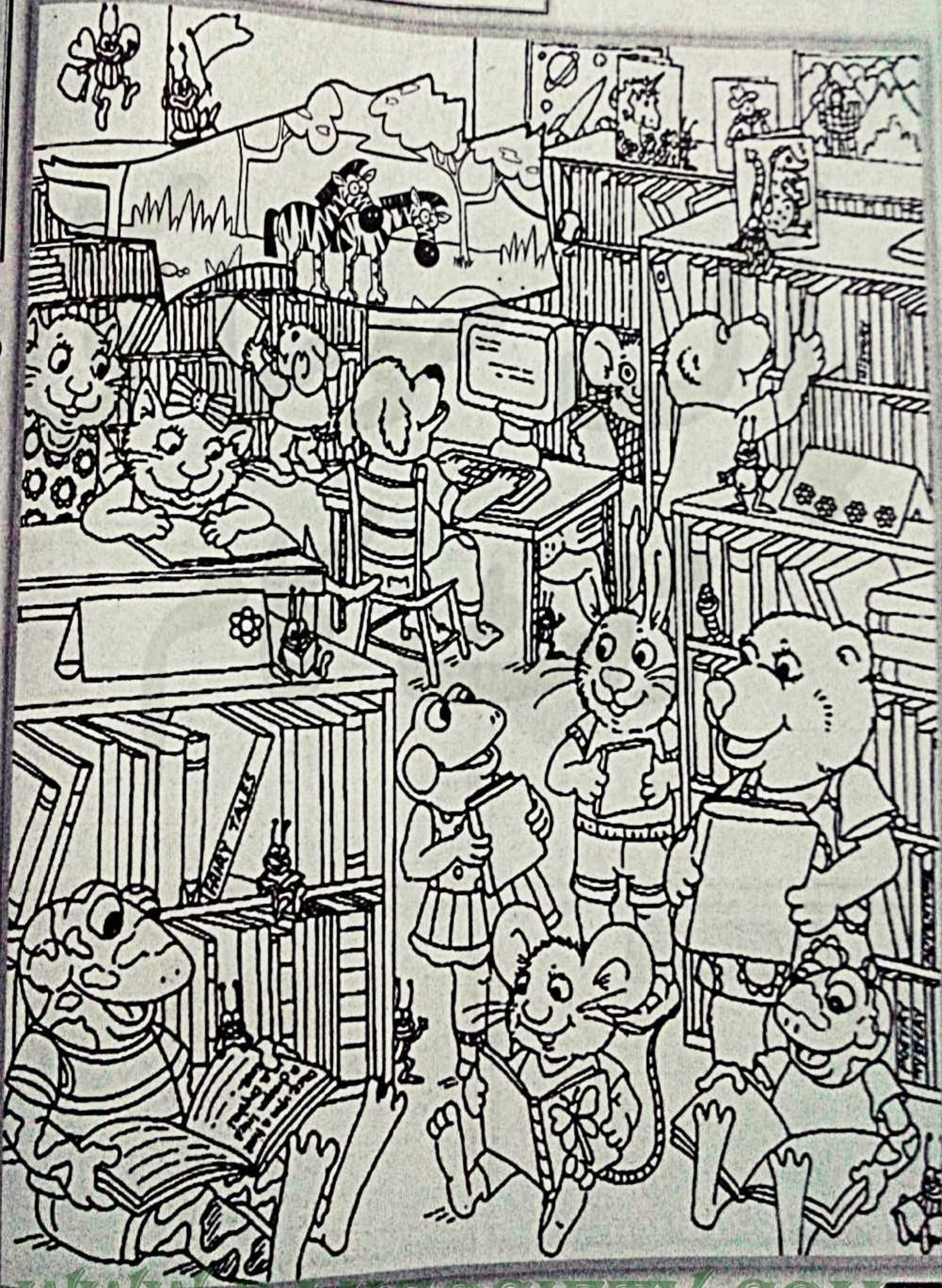
خنساء امتیاز، راول پنڈی
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریب لوگوں کا مفت علاج کروں گی۔

عبدالرافع خان، فیصل آباد
میں انجینئر بن کر اپنے ملک کا نام روشن کروں گا۔

مبشر حنیف جوشی، ہروڈ سلطان
میں انجینئر بن کر ملک وقوم کی خدمت کروں گا۔

میرب زبیر، گوجرانوالہ
میں کرکٹر بن کر اپنے ملک کا نام روشن کروں گی۔

نورالہدیٰ، ملتان
میں آرمی میں ڈاکٹر بن کر لوگوں کی خدمت کروں گی۔

حسنین احمد، رحیم یار خان
میں پائلٹ بنوں گا اور اپنے والدین اور ملک کا نام روشن کروں گا۔

ابرارالحق، کراچی
میں بڑا ہو کر دین اسلام کی روشنی پھیلاؤں گا۔

قمر سلیم، کراچی
میں بڑا ہو کر آرمی جوائن کر کے ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

محمد حذیفہ ندیم، لاہور
میں والدین کا فرماں بردار بنوں گا اور دنیا میں دین کی روشنی پھیلاؤں گا۔

سیرت فاطمہ، اسلام آباد
میں آرمی جوائن کر کے ملک وقوم کی خدمت کروں گی۔

مریم صدیقہ، گوجرانوالہ
میں بڑی ہو کر سائنس دان بننا چاہتی ہوں۔

عبیداللہ وسیم، ایبٹ آباد
میں ایک اچھا مسلمان اور عالم دین بن کر والدین اور ملک وقوم کا نام روشن کروں گا۔

ارسلان شہزاد، کراچی
میں آرمی جوائن کر کے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

اُزویٰ امان اللہ، لاہور
میں سائنس دان بنوں گی اور انسانیت کی خدمت کروں گی۔

حنظلہ سعید، فیصل آباد
میں ملک وقوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

علی حیدر اعجاز، بہاول پور
میں حافظ قرآن بنوں گا اور ڈاکٹر بھی بنوں گا اور ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

محمد ارسلان، تلہ گنگ
میں ڈاکٹر بن کر انسانیت کی خدمت کروں گا۔

درمکنون، گجرات
میں ڈاکٹر بن کر ملک وقوم کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔

ابرار نیاز محمد، کراچی
میں فوجی بن کر پاکستان کی حفاظت کروں گا۔

محمد حمزہ مقصود، لاہور
میں سافٹ ویئر انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

علی حیدر، راول پنڈی
میں فائیٹر پائلٹ بن کر ملک کا نام روشن کروں گا۔

محمد گوہر مصطفیٰ، صادق آباد
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گا۔

قمر زمان، قائم بھروآنہ
میں پاک فوج جوائن کر کے شہادت کا رتبہ حاصل کروں گا۔

نزل سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ
میں فوج میں جاؤں گی اور خواتین کی راہ نمائی کروں گی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

بوجھو تو جانیں

1- تین ہیں لیکن ایک شکل کے
تینوں خوب ہیں موٹے تازے
ایک کا قد ہے تھوڑا سا لمبا
باقی دونوں چھوٹے قد کے

2- چوری کرنے باغ میں جائے
مالی بھی اس سے ڈر جائے
رنگ برنگے پھول وہ چرائے
کوئی بھی اسے روک نہ پائے

3- راستہ کہیں کا یہ نہ جانے
منزل اس کی کوئی نہ پہچانے
بازاروں میں یہ چلتا بھی ہے
سفر مسلسل کرتا بھی ہے

(طوبیٰ وحید، ہری پور)

4- دیکھی ہم نے ایک مشین
کھانے پینے کی شوقین
جب چاہو وہ کھولے پیٹ
اس میں لے ہر چیز سمیٹ

5- کھائے لوہا اگلے آگ
گائے ہر دم موت کے راگ

(محمد افضل انصاری، چونگ سٹی)

6- ایک گز کا پھول
کبھی کلی کبھی پھول

7- سفید مرغی ہری پونچھ
بتا تو بتا نہیں تو خالہ سے پوچھ

8- ایک گھڑے میں بارہ خانے
ہر خانے میں تیس دانے

9- چھوٹی سی ڈبیا میں کالا کبوتر
نانی کا بیٹا عبدالغفور

(حرا سعید شاہ، جوہر آباد)

راستہ بتاؤ:

نقطے ملاؤ اور رنگ بھرو:

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ باب الریحان جنت کا ایک دروازہ ہے۔ یہاں سے کون سے لوگ جنت میں داخل ہوں گے؟

i۔ روزہ دار ii۔ حاجی iii۔ نمازی

2۔ "بیت العتیق" کس مقدس جگہ کو کہا جاتا ہے؟

i۔ خانہ کعبہ ii۔ مسجد قبا iii۔ روضہ رسولؐ

3۔ سلطان ٹیپو کے عہد میں بندوق کا کیا نام رکھا گیا؟

i۔ تفنگ ii۔ ماثور iii۔ ذوالفقار

4۔ یہ شعر کس کا ہے؟

بٹ مار اجل کا آ پہنچا ٹک اس کو دیکھ ڈرو بابا
اب اشک بہاؤ آنکھوں سے اور آہیں سرد بھرو بابا

i۔ نظیر اکبر آبادی ii۔ حیدر علی آتش iii۔ مرزا غالب

5۔ علامہ اقبال کی والدہ ماجدہ کی تاریخ وفات کیا ہے؟

i۔ 9 نومبر 1914ء ii۔ 10 دسمبر 1914ء iii۔ 15 اکتوبر 1914ء

6۔ سورج گرہن کے وقت اس کے گرد نظر آنے والا چمکیلا حلقہ کیا کہلاتا ہے؟

i۔ لوانا ii۔ کورونا iii۔ لوزونا

7۔ سکھر کا پرانا نام کیا ہے؟

i۔ سکر ii۔ سکر iii۔ سکر پورہ

8۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان سرحدی خط کو کیا کہا جاتا ہے؟

i۔ ڈیورنڈ لائن ii۔ ریڈکلف لائن iii۔ کرزن لائن

9۔ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل قائداعظم کی مدت حکومت کیا ہے؟

i۔ 15 اگست 1947ء تا 11 اکتوبر 1948ء ii۔ 15 اگست 1947ء تا 11 ستمبر 1948ء iii۔ 15 اگست 1947ء تا نومبر 1949ء

10۔ بابائے اُردو کسے کہا جاتا ہے؟

i۔ مولوی عبدالحق ii۔ مولانا آزاد iii۔ حفیظ جالندھری

جوابات علمی آزمائش مئی 2014ء

1۔ سورۂ عنکبوت 2۔ جنگ فجار 3۔ احمد نقوی 4۔ مولانا ظفر علی خان 5۔ دادو، سندھ 6۔ لان ٹینس 7۔ ہری پور، ہزارہ 8۔ ڈاکٹر وزیر آغا 9۔ احمق 10۔ حضرت علیؓ

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ عائشہ رشید، مریدکے (150 روپے کی کتب)
☆ صائم نواز قادری، کامونکی (100 روپے کی کتب)
☆ دُرِ شہوار، لاہور (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:
عبداللہ عارف کلیم، محمد حمزہ مقصود، مہر اکرم، مطیع الرحمٰن، حیدر علی، فضا کیانی، ضحیٰ بدر، حدیقہ عارف، نبیہ جمیل، حمزہ عدنان، لاہور۔ حیدر علی رانا، کوٹ مومن۔ عبید اکرم شریف، ہرنولی۔ ہاجرہ ابراہیم ورک، راولپنڈی۔ محمد مجیر خان، بھکر۔ محمد زین، خدیجہ فہد، عنایہ فہد، گوجرانوالہ۔ محمد حارث صدیقی، پشاور۔ عبداللہ انعام، گجرات۔ محمد ریان طیب، راولپنڈی۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ محمد صابر قمر، لاہور۔ زینب محمود، گوجرانوالہ۔ ردہ فاطمہ، ستیانہ بنگلہ۔ طلحہ اعجاز، باڑہ ہملٹ۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ ردا نور، فیصل آباد۔ نمرہ لاریب، کوہاٹ۔ محمد عبداللہ ثاقب، پشاور۔ صفی الرحمٰن، لاہور۔ علینہ عامر، فیصل آباد۔ سید محمد علی حسن، لاہور۔ فہد امین، گوجرانوالہ۔ محمد عمر عطاء قادری، محمد مجیب الرحمٰن قادری، خدیجہ نشان قادری، کامونکی۔ محمد اسد عبداللہ قادری، محمد مظہر اکرم قادری، محمد حاشر علی قادری، حسن رضا سردار قادری، صدام حسین قادری، محمد معین الدین قادری، کامونکی۔ عبداللہ، لاہور۔ زین العابدین، کراچی۔ تحریم، سیال کوٹ۔ علینہ حسین، سرگودھا۔ صباء جاوید، اٹک۔ محمد حارث، بھکر۔ زین ایاز، احمد ایاز، لاہور۔ اذلان شجاعت، کامران شجاعت، امامہ شجاعت، گوجرانوالہ۔ ☆☆

جاگو جاگو ہوا سویرا

لو وہ دیکھو سورج نکلا
چاندی سے بھی زیادہ اُجلا
کرنیں چمکیں شبنم بھاگی
باغ کی پتی پتی جاگی
کوسوں بھاگا دُور اندھیرا
جاگو جاگو ہوا سویرا!

چوں چوں چڑیا بول رہی ہے
اُڑنے کو پَر تول رہی ہے
کلیاں آنکھیں کھول رہی ہیں
رنگ ہوا میں گھول رہی ہیں
رنگ برنگے پھول کھلیں ہیں
شبنم سے کیا خوب دھلے ہیں

چاروں جانب خوش بو پھیلی
گھاس ہری ہے گیلی گیلی
بچے جاگے بوڑھے جاگے
اپنے اپنے کام پہ بھاگے
اچھا نہیں ہے سوئے رہنا
یوں غفلت میں کھوئے رہنا
جاگو جاگو محترم جاگو
بستہ لو اسکول کو بھاگو

ہمارے گھروں اور محلے میں بھنبھناتی مکھیوں کا سائنسی نام "Musca Domestica" ہے۔ اس کا تعلق فائیلم آرتھروپوڈا

سے ہے۔ گھریلو مکھی یا House Fly سب سے زیادہ دکھائی دینے والی مکھیوں میں سے ایک ہے۔ یہ مکھی متعدد بیماریاں پھیلانے کے حوالے سے اہم ہے۔ بالغ مکھی 5 سے 8 ملی میٹر لمبی ہوتی ہے۔ ان کی رنگت گرے (Gray) یا سیاہ (Black) ہوتی ہے۔ مادہ مکھی سائز میں کچھ بڑی ہوتی ہے۔ یہ دو پروں کی مدد سے اُڑتی ہیں۔ مادہ مکھی اپنی زندگی میں لگ بھگ 9000 انڈے دیتی ہے جب کہ ایک وقت میں 75 سے 150 انڈے دیتی ہے۔ انڈے سفید اور ان کی لمبائی 1.2 ملی میٹر ہوتی ہے۔ انڈے سے لاروے نکلتے ہیں جو 3 سے 9 ملی میٹر لمبے ہوتے ہیں۔ ہیضہ، پیچش، ٹائیفائیڈ وغیرہ جیسی بیماریاں پھیلانے کا موجب بنتی ہیں۔ جینیٹکس (Genetics) کی تحقیق میں انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ مکھیاں گلے سڑے مادوں سے خوراک حاصل کرتی ہیں۔

بنگلہ دیش کا پرچم

مشرقی پاکستان جو اب علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش کہلاتا ہے، اس کا قومی پرچم سرکاری طور پر 17 جنوری 1972ء کو سامنے آیا۔ اس کا رنگ سبز ہے جس کے درمیان میں گہرا سرخ رنگ کا تھال بنا ہے۔ یہ تھالی نما ساخت بنگال کی سرزمین پر بلند ہوتے سورج کو ظاہر کرتا ہے اور بنگلہ دیش کے قیام میں جان قربان کرنے والے افراد کے خون کی بھی نمائندگی کرتا ہے جب کہ سبز رنگ بنگال کی سرزمین کا اظہار ہے۔
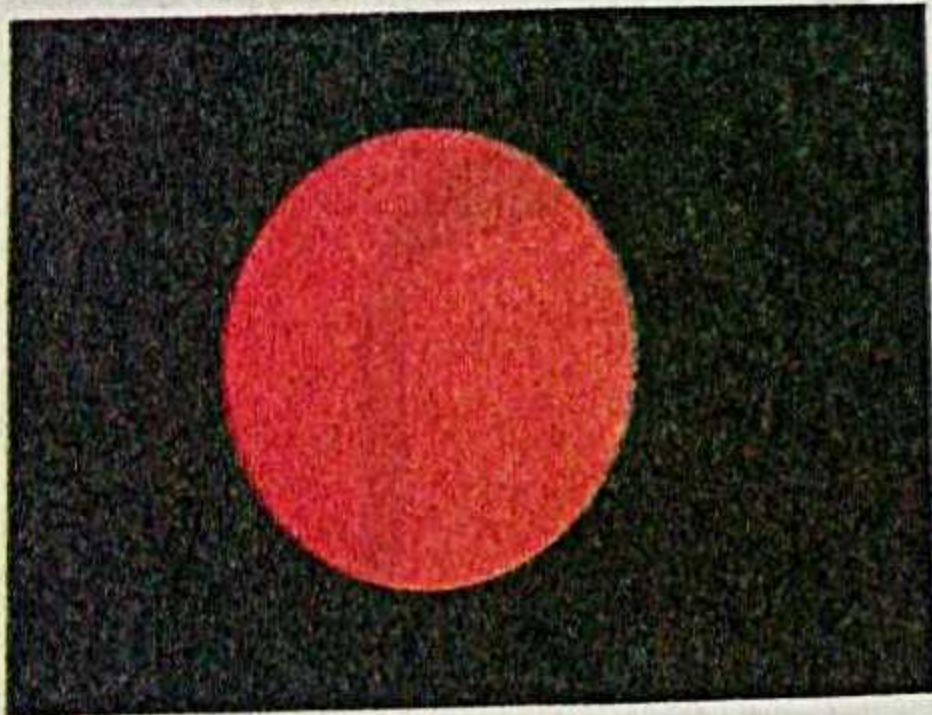
ابتداء میں سرخ رنگ کے تھال کے درمیان میں پیلے رنگ کا بنگلہ دیش کا نقشہ بھی بنا تھا لیکن 1972ء میں اسے ختم کر دیا گیا۔ بنگلہ دیش کا پرچم "Shib Narayan Das" نے ڈیزائن کیا جب کہ اس کے لیے کپڑا ایک درزی "Bazlur Rahman" نے پیش کیا تھا۔ سب سے پہلے یہ پرچم ڈھاکہ یونیورسٹی میں ایک سٹوڈنٹ لیڈر "A.S.M Abdur Rab" نے لہرایا۔ یہ پرچم سرکاری شخصیات کی گاڑیوں اور اہم عمارتوں پر لہرایا جاتا ہے۔

دھنیا

سالن میں خوشبو کے لیے دھنیا(Coriander) ڈالا جاتا ہے۔ دھنیا کا سائنسی نام "Coriandrum Sativum" ہے۔ اس کے خاندان کا نام "Apiaceae" ہے۔ دھنیا غذائیت کا حامل ہے۔ اس میں نشاستہ، چکنائی، پروٹین اور پانی پایا جاتا

ہے۔ دھنیا وٹامن اے، وٹامن بی، وٹامن B ون، نیاسن (Niacin)، فولیٹ، وٹامن سی، وٹامن ای، وٹامن کے، کیلشیم، میگنیشیم، میگنیز، فاسفورس، پوٹاشیم، سوڈیم اور زنک کا خزانہ ہے۔ یہ یورپ، افریقہ اور ایشیاء کا فطری و مقامی پودا ہے۔ اس کی بلندی 20 انچ یا 50 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ اس کے پھول گچھے کی صورت میں ہوتے ہیں جو سفید یا ہلکے گلابی رنگ کے ہوتے ہیں۔ دھنیے کا پھل گول ہوتا ہے جس کا سائز 3 سے 5 ملی میٹر ہوتا ہے۔ دھنیے کے بیج بھی سالن میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے پتے سالن میں خوشبو پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ یہ چٹنی و سلاد کا بھی حصہ ہوتے ہیں۔ تھائی لینڈ کے لوگ ان کی جڑیں بھی کھانوں میں استعمال کرتے ہیں۔ دھنیے سے کئی امراض کا علاج بھی کیا جاتا ہے۔

ٹارزن

بچوں کے ادب میں ٹارزن(Tarzan) کا کردار بڑا مقبول ہے۔ کئی رسالے، ناول، کہانیاں، فلمیں اور کارٹونز اس موضوع پر بنائے جا چکے ہیں۔ ایڈگر رائس (Adgar Rice) اس افسانوی کردار کا خالق ہے۔ یہ پہلی بار "Tarzan of the Apes" کے نام سے سامنے آیا۔ یہ ناول بڑا مقبول ہوا۔ اس کے مطابق ایک بچہ افریقہ کے جنگلوں میں بندروں کے ساتھ پل کر بڑا ہوتا ہے۔ یہ بچہ شہر کی طرف جاتا ہے لیکن انسانوں کے ہاتھوں تنگ ہو کر واپس جنگل کا باسی بن جاتا ہے۔ یہ کردار 1912ء میں پہلی بار سامنے آیا۔ بنیادی طور پر ٹارزن ایک کھاتے پیتے گھر کا بچہ تھا جن کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ جنگلی حیات کے ساتھ رہ کر وہ کئی طرح

کی خوبیوں کا مالک بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کردار وہ کام بھی کر سکتا ہے جو عام انسان نہیں کر سکتا۔ اس کی طاقت، پھرتی، مہارت، بھاگنا، تیرنا، چھلانگ لگانا سب بڑا زور دار ہے۔ بچوں کے لیے تخلیق کردہ افسانوی کرداروں میں ٹارزن آج بھی مقبول سلسلہ ہے۔ اس کردار کو مزید لکھاریوں نے بھی اپنی فلموں، ڈراموں اور کارٹونز کا حصہ بنایا ہے۔

معلوماتِ عامہ

- دُنیا کی سب سے گہری جھیل بیکال (سائبیریا) ہے۔
- نمکین سمندر بحیرۂ مردار کو کہتے ہیں۔
- دُنیا میں سب سے بلند بت نیویارک میں آزادی کا مجسمہ ہے۔
- دُنیا کے سب سے اونچے خطے کا نام تبت ہے۔
- دُنیا میں شدید ترین بارش کا خطہ چراپونجی (آسام) ہے۔
- دُنیا کی سب سے بڑی پرانی عمارت اہرامِ مصر ہے۔
- دُنیا کا سب سے لمبا پل سان فرانسسکو پل ہے۔
- زمین سورج کے گرد 66600 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہے۔

(عتیق الرحمٰن، نوشہرہ)

- زمین اپنے محور پر 1000 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہے۔
- سان مائیکل آتش فشاں پہاڑ سلواڈار ملک میں ہے۔
- خلا میں سب سے پہلے جنوری 1959ء میں روس کا پرچم بھیجا گیا تھا۔
- ہندوستان میں پانڈے چری کی بندرگاہ فرانسیسیوں نے بنوائی تھی۔
- ماسکو شہر کا زمین دوز ریلوے اسٹیشن سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے۔
- بنگلہ دیش کا قومی نشان نرگس کا پھول ہے۔
- چین کے وزیرِاعظم چو این لائی کا انتقال 7 جنوری 1976ء میں ہوا تھا۔
- دُنیا میں سب سے پہلے خاتون ڈاکٹر ماریا مونٹیسوری نے ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری لی تھی۔

(زینت اعجاز، لاہور)

- دُنیا میں سب سے زیادہ زلزلے جاپان میں آتے ہیں۔
- واسکوڈے گاما سکندر لودھی کے عہد میں برِصغیر میں آیا تھا۔
- دُنیا کی سب سے پرانی ایئر لائن ہالینڈ میں ہے۔
- واپڈا ہاؤس کا نقشہ ایڈورڈ اسٹون نے تیار کیا تھا۔
- چین کے سب سے بڑے سول اعزاز کا نام آرڈر آف سن یات سین ہے۔
- دُنیا میں سب سے زیادہ چینی زبان بولی جاتی ہے۔
- سات دنوں کا ہفتہ بنی اسرائیل قوم نے ایجاد کیا تھا۔

- پہلا مسلمان فلسفی یعقوب کندی کو کہا جاتا ہے۔
- دُنیا میں سب سے زیادہ دودھ فن لینڈ میں ہوتا ہے۔
- اقوامِ متحدہ کے پہلے سیکریٹری جنرل کا نام ناروے کے ٹرگ ولی تھا۔
- ملک ڈنمارک کو یورپ کی ساس کہا جاتا ہے۔
- سن ہجری کا آغاز 622 سن عیسوی میں ہوا تھا۔
- اہرامِ مصر دُنیا کا پہلا عجوبہ ہے۔

(فیصل محمود، ملتان)

- فرانس کو مصوروں کا ملک کہتے ہیں۔
- بھارت کے جواہر لال نہرو نے دی انڈیپینڈنٹ اخبار جاری کیا تھا۔
- زبان کے مطالعے کے علم کو لسانیات کہتے ہیں۔
- آبادی کے لحاظ سے برِاعظم ایشیا، میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔
- پھولوں کا بادشاہ گلاب کے پھول کو کہا جاتا ہے۔
- اقوامِ متحدہ کے قیام کے وقت رکن ممالک کی تعداد 95 تھی۔
- بارش کا پانی صاف نہیں ہوتا۔

(کرن بٹ، سیال کوٹ)

- دُنیا کے سب سے چھوٹے قد کے انسان کا نام کلیون اور اس کا قد دو فٹ دو انچ تھا۔
- دُنیا کا سب سے چھوٹا انسان 21 سال کی عمر میں 1812ء میں فوت ہوا تھا۔
- صنوبر کے درخت کو سب سے پرانا درخت کہا جاتا ہے۔
- اقوامِ متحدہ میں ویٹو کا حق امریکہ، برطانیہ، چین، فرانس اور روس کو حاصل ہے۔
- امریکہ کی تاریخ میں پہلی بار صدر رچرڈ نکسن نے استعفیٰ دیا۔
- خلا میں سب سے پہلا بھیجا جانے والا انسان روس کا گگارین تھا۔
- دُنیا میں سب سے زیادہ گھنے جنگلات انڈونیشیا میں ہیں۔
- شطرنج کے مہروں کی تعداد 32 ہوتی ہے۔
- لندن کے مشہور گھنٹہ گھر کا نام بگ بین ہے۔
- سب سے پہلے روس نے خلاء میں 12 اپریل 1961ء کو خلائی جہاز بھیجا۔

(وقاص حبیب، کراچی)

تکہ بوٹی

منور جہاں خورشید

سامان اور وزن:

گوشت	آدھ سیر (ایک مربع انچ کے چوکور ٹکڑے بنوالیں)	نمک اور لال مرچ	پسی ہوئی حسب ذائقہ
لہسن	آٹھ جوئے	دھنیا پسا ہوا	چائے کا ایک چمچ
سفید زیرہ	ایک چمچ	ادرک	آدھی چھٹانک
گرم مسالے پسے ہوئے	ایک چمچ	گھی	ایک چھٹانک
سرکہ	ایک پیالی	اجوائن	ایک چٹکی
دہی	چھٹانک بھر یا آدھ پاؤ	لونگیں	دو عدد
دارچینی	ایک ٹکڑا	لیموں	ایک عدد

ترکیب:

گوشت کے ٹکڑوں پر نمک اور پسا ہوا لہسن لگا کر سرکے میں ڈبو کر رکھ دیں۔ ایک سے دو گھنٹے تک پڑے رہیں۔ دیگچی میں تین پیالی پانی ڈالیں۔ اس میں لونگیں اور دارچینی ڈال کر گوشت کے ٹکڑے ابال لیں۔ جب ادھ گلے ہو جائیں تو پانی خشک کر کے اتار لیں۔ دہی پھینٹ کر اس میں ادرک، دھنیا، لال مرچ، نمک، زیرہ، اجوائن، اور گرم مسالا (تمام مسالا پسا ہوا) ملا دیا جائے۔ گوشت کے ادھ گلے ٹکڑوں کو ٹھنڈا کر کے ان پر یہ مسالا اچھی طرح مل دیا جائے (جذب کرنے کی کوشش کی جائے) پھر ان ٹکڑوں کو سیخ پر لگا کر دہکتے کوئلوں پر سینکیں۔ سینکتے وقت ان کے اوپر ذرا ذرا سا گھی ٹپکاتے جائیں، سرخ ہونے پر اتار لیں۔ لیموں کا عرق نچوڑ کر ان میں ذرا سا پانی ڈال دیا جائے۔ اس میں سلاد کے پتے تر کر کے ڈش میں سجا دیے جائیں۔ ان پر تکے رکھ دیے جائیں۔ اوپر مولی کا کدوکش، گاجر کا کدوکش، پیاز کے لچھے، ٹماٹر کے قتلے، آلو تلے ہوئے اور گوبھی کے پھول تلے ہوئے رکھ کر کھانے کو پیش کریں۔ دہی میں پودینے کی چٹنی لذت کو دوبالا کرے گی۔

ضرب المثل کہانی

زبیدہ سلطانہ

کڑوا کریلا نیم چڑھا

زینب کے صحن میں نیم کا درخت تھا جس کے نیچے کیاریاں بنا کر اس نے کریلے کے بیج بوئے۔ جب بیلیں بڑھیں تو انہیں نیم کے درخت پر چڑھا دیا۔ جب کریلے لگے اور بڑھ کر پکانے کے قابل ہو گئے تو ایک دن زینب نے کچھ کریلے توڑ کر پکائے۔

کریلے تو کڑوے ہی ہوتے ہیں مگر جب کھاتے ہوئے زینب کے شوہر کو سالن کچھ زیادہ ہی کڑوا محسوس ہوا تو اس نے خفا ہو کر بیوی سے کہا:

"کریلے ایک تو ویسے ہی کڑوے ہوتے ہیں، مزید یہ کہ تم نے ان کی بیلیں نیم پر چڑھا دیں، اسی وجہ سے اور زیادہ کڑوے ہو گئے ہیں۔"

زینب ہنسنے لگی اور بولی: "یہ آپ نے خود بخود فرض کر لیا کہ نیم پر چڑھا کریلا اور بھی کڑوا ہوگا؟"

کچھ دنوں بعد زینب کا شوہر کام سے واپس آیا۔ تھکا ہوا تھا، آرام کرنے کو لیٹ گیا۔ اتنے میں اس کے دونوں لڑکے آپس میں لڑنے اور ایک دوسرے کو نوچ کھسوٹ کر کے اونچی آواز میں رونے لگے۔ ان کی دادی نے اٹھ کر دونوں کو جھنجھوڑا اور ایک ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے بولیں:

"باپ کی جان کے دشمن ہو۔ وہ تھکا ہارا آتا ہے تو اسے دو گھڑی آرام بھی کرنے نہیں دیتے۔" اماں کی چیخ پکار سے بیٹے کی آنکھ کھل گئی اور ماں کو اپنی ہمدردی میں بولتے سنا۔ پھر اسے بچوں کے رونے پر غصہ آ گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بچوں کو بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ ایک بچے کے سر پر شدید چوٹ آئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ یہ دیکھ کر زینب کو بھی غصہ آ گیا اور وہ کہنے لگی:

"اماں! آپ کا بیٹا ایک تو خود ہی غصے کا تیز ہے، اوپر سے آپ کی باتیں انہیں اور شہ دیتی ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ایک تو کریلا خود کڑوا، اوپر سے نیم چڑھا۔"

☆☆☆

مختصر مختصر

قائداعظمؒ

عزم ہمت کا نشان تھا قائد اعظم
مسلم ملت کا پاسبان تھا قائد اعظم

ظلمت میں روشنی کا نشان تھا قائد اعظم
قوم کے مقدر کا امین تھا قائد اعظم

جذبہ شہادت کا راہنما تھا قائد اعظم
آزادی کا ترجمان تھا قائد اعظم

اخوت و محبت کا ولولہ تھا قائد اعظم
بہادری و شجاعت کا مجسمہ تھا قائد اعظم

خون مسلم کا نشان تھا قائد اعظم
فرنگ کے لیے چٹان تھا قائد اعظم

قوم کی عزت کا نگہبان تھا قائد اعظم
اس کی خاطر سرگرداں تھا قائد اعظم

ناموں کی طرح روشن تھا قائد اعظم
محمد علی جناح تھا قائد اعظم

(کاوش: اسد علی اسد، ملتان)

دُنیا کی تمام ماؤں کے نام

ذرا سی چوٹ لگے تو وہ آنسو بہا دیتی ہے
اپنی سکون بھری گود میں ہم کو سلا دیتی ہے
ہوتے ہیں جب ہم خفا تو دُنیا کو بھلا دیتی ہے
مت گستاخی کرنا لوگو!
اس ماں سے
کیوں کہ!
جب وہ چھوڑ کے جاتی ہے تو گھر کو قبرستان بنا دیتی ہے
اللہ ہر کسی کی ماں کو سلامت رکھے۔ آمین!

(مومنہ احسن، فیصل آباد)

سنتِ رسولؐ کا فائدہ

ایک دن نبیؐ صحابہ کرامؓ سے ارشاد فرما رہے تھے: ''پانی دیکھ کر پیو۔'' ایک یہودی بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے بھی یہ ارشاد سن لیا۔ رات کو جب پانی پینے لگا تو بیوی سے کہا کہ چراغ لے آؤ۔ جب بیوی چراغ لے کر آئی تو دیکھا کہ پانی کے پیالے میں ایک کالا بچھو تیر رہا ہے۔ صبح دربارِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر سارا واقعہ سنایا اور کہا کہ ''یہ دین کتنا پیارا ہے۔'' اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔

(گوہر زمان سندھو)

چھوٹی بہن

چھوٹی بے بی سوتی ہے ماما کپڑے دھوتی ہے
ہما کمرے میں آئی ہاتھ میں سلیٹ لائی
سلیٹ زور سے گر پڑی بے بی فوراً رو پڑی
شور سے بے بی جاگی ہما کمرے سے بھاگی

دانائی کیسے سیکھی؟

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی نے حضرت لقمان سے دریافت کیا کہ انہوں نے دانائی کی باتیں کس سے سیکھی ہیں؟ حضرت لقمان نے جواب دیا: ''کم عقلوں اور جاہلوں سے۔'' پوچھنے والے نے پھر سوال کیا: ''حضرت، وہ کیسے؟'' حضرت لقمان نے فرمایا: ''جب کوئی نادان اور کم عقل حماقت کرتا ہے تو میں اس کا انجام دیکھ کر عبرت حاصل کرتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ مجھ سے ویسی حماقت سرزد نہ ہو۔''

(حامد علی، جوہر آباد)

دانا کون ہے؟

☆ دانا وہ شخص ہے جو اپنی حماقت و جہالت کے سوا کسی کو اپنا دشمن خیال نہ کرے۔

☆ دانا وہ ہے جو اپنے کام کو کسی کے بھروسے پر نہ چھوڑے۔
☆ دانا وہ ہے جو اپنی غلطی کو قبول کرنے میں دیر نہ کرے۔
☆ دانا وہ ہے جو وقت اور روپے کو بے جا صرف نہ کرے۔
☆ دانا وہ ہے جو اپنی خواہشات کو کم کرے اور ضروریات کو گھٹائے۔

(محمد یوسف وحید، خان پور)

زندگی

☆ زندگی ایک کھیل ہے جس میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے۔
☆ زندگی ایک حسین خواب ہے۔ اس کو سمجھو۔
☆ زندگی ایک للکار ہے۔ اس کا مقابلہ مردانہ وار کرو۔
☆ زندگی کا ہر لمحہ نئے واقعات سے عبارت ہے۔
☆ زندگی ایک لمبی مسافت ہے جس کا انجام موت ہے۔

(اقراء شہزادی، فیصل آباد)

اقوالِ زریں

☆ کوئی بھی رشتہ بدن پر پہنا ہوا لباس نہیں ہوتا کہ جسے اتار کر پھینک دیا جا سکے اور دوسرا بدل لیا جائے۔
☆ زندگی چاہتے ہو تو موت پر یقین رکھو۔
☆ ناکامی کامیابی کا زینہ ہے کیوں کہ ستارے اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔
☆ بلند مقام ہمیشہ اپنے آپ کو بلند کرنے سے ملتا ہے نہ کہ نعرے اور جھنڈے بلند کرنے سے۔
☆ جو قوم اپنے لباس، زبان اور تاریخ کو فراموش کر دے وقت اسے بھی فراموش کر دیتا ہے۔

(ایمل سہیل، ایبٹ آباد)

بکھرے موتی

☆ ساکھ بنانے میں بیس سال لگتے ہیں اور یہ ساکھ پانچ منٹ میں برباد ہو جاتی ہے۔ (وارین لفٹ)
☆ سیدھی اور صاف بات کرنے سے نقصان بہت تھوڑا مگر فائدہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ (لارڈ میکالے)
☆ جو دوسروں کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے، وہ حقیقت میں اپنے کردار کی برائیاں دوسروں میں تلاش کر رہا ہوتا ہے۔ (خلیل جبران)
☆ توبہ، انسان کو ہر قصور سے بری کر دیتی ہے۔ (الفارابی)

☆ غصہ ایک چور ہے جو ہمیشہ انسان کے اچھے لمحات چوری کر لیتا ہے۔ (جو۔ این۔ لندن)

(کرن فاروق، گوجرانوالہ)

چمکتے موتی

☆ ظالم کے ظلم سے نہیں، صابر کے صبر سے ڈرو۔ ☆ کسی کو حقیر مت سمجھو کیوں کہ راستے کا معمولی پتھر بھی منہ کے بل گرا سکتا ہے۔ ☆ جس کو اپنا خیال نہیں وہ کسی کا خیال نہیں رکھ سکتا۔ ☆ گفتگو چاندی ہے اور خاموشی سونا۔ ☆ کبھی نہ گرنا کمال نہیں بلکہ گر کر سنبھل جانا کمال ہے۔

پاکستان

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے فرمایا: ”اگر اسی طرح تمام ملت، ہمت اور لگن کے ساتھ کام کرتی رہی تو ہماری یہ مصیبتیں ان شاء اللہ بہت جلد ختم ہو جائیں گی۔“

نظریے سے ابتداء ہوئی ہے۔ مشکل راہ پر چلتے چلتے جب جذبے اور جانیں قربان ہوئیں تو اس خواب کی حسین تعبیر کو پاکستان کہتے ہیں۔ قربانی کی قیمت چکا کر جو کچھ ملا، اس سے ایک نئی شروعات کرتے ہیں۔ میدان کوئی بھی ہو..... ملی، عسکری، معاشی، ابتداء میں مشکل ہی ہوگی۔ پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں کا سفیدہ، سبزہ زاروں کا اُجلا ہرا رنگ، دریاؤں کا شفاف پانی، صحراؤں کی ریت سے منعکس ہوتی روشنی اور سمندر۔ زمین اپنے ساتھ خزانے لاتی ہے۔ کوئلے کی کان میں چھپی توانائی کے انعام۔ زمین بھی زرخیز ہے تو ذہن بھی زرخیز ہوں تو ناممکنات، ممکنات لگتے ہیں۔ علوم پروان چڑھتے ہیں اور اس مسلسل محنت کا معاوضہ ترقی کی راہوں کا گُل بنتا ہے۔ قوم کا وجود توانا ہوتا ہے۔ ملت میں خود انحصاری آتی ہے۔ یہ راہ بھی نسلیں مل کر طے کرتی ہیں۔ ایک نسل دوسری نسل کو اپنی ذمہ داریاں منتقل کرتی رہیں تو پھر خواب خواب نہیں رہتا، ایک روشن مستقبل بن جاتا ہے۔ پاکستان ایک عظیم نسل کا خواب ہے۔ ہمارا ماضی اور حال اتنا روشن ہے کہ دُنیا بھر میں اپنا لوہا منوا سکتے ہیں۔ ہم سب ایک ہیں اور پاکستان ہمیشہ تابندہ رہے گا۔

(کاوش: عبدالرحمن، راول پنڈی)

☆☆☆

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

ساجد نے راشد کے سامنے ایک شیشے کے جگ میں تھوڑا سا پانی ڈالا اور پھر اس میں ایک برف کا چھوٹا سا ٹکڑا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد وہ ایک دھاگہ لے کر آیا اور راشد سے کہا کہ وہ دھاگے کی مدد سے برف کا ٹکڑا جگ سے باہر نکال دے لیکن شرط یہ ہے کہ اسے دھاگے سے باندھا نہ جائے۔ اس کے علاوہ کسی لکڑی، پنسل یا چمچ وغیرہ کا استعمال نہ کیا جائے۔ راشد سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ آخر تھک ہار کر اس نے کہا کہ یہ کام ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اتنے میں ایمن آ گئی۔ اس نے کہا کہ بھئی کیا ہو رہا ہے، کیا مشکل ہے؟ ساجد نے ایمن کو بھی آزمانے کو کہا۔ ایمن بہت ذہین تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر اس نے ایسا کر دکھایا۔ ذرا سوچ کر بتائیے اس نے کس ترکیب سے دھاگے سے باندھے بغیر دھاگے کی مدد سے برف کا ٹکڑا جگ سے نکالا؟
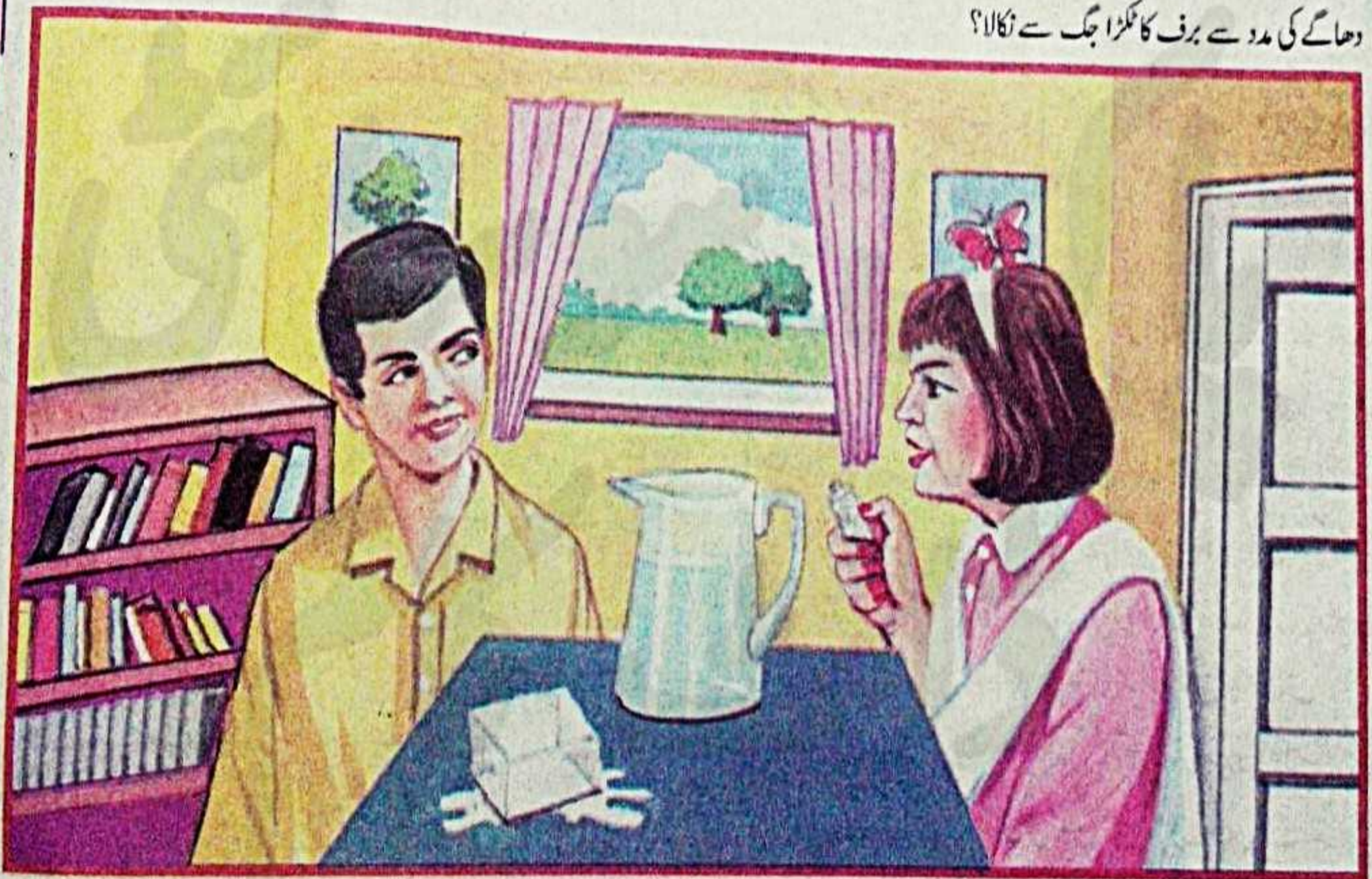
مئی 2014ء میں شائع ہونے والے "کھوج لگائیے" کا صحیح جواب یہ ہے:

الیکٹرک ٹرین کا انجن دھواں نہیں دیتا۔

مئی 2014ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

زینب محمود، نوشہرہ ورکاں	عبداللہ طاہر، گوجرانوالہ
عنان عابد، لاہور	ایمان زہرہ، لاہور
محمد مجیب الرحمٰن قادری، کاموکی	

دُوسرا فرض

اس روز علی اکبر کی طبیعت کافی بہتر تھی۔ اس کے سر کے زخم کی پٹی اتر گئی تھی۔ بازو کے زخم کا بھی یہی حال تھا۔ البتہ اس کی پیٹھ کے زخم پر ابھی پٹی بندھی تھی اور ڈاکٹر نے کہا تھا کہ کم از کم ایک ہفتہ اور اسے اسپتال میں رہنا پڑے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے ڈاکٹر صاحب اسپتال چھوڑنے کی اجازت دے دیں مگر ڈاکٹر صاحب اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ البتہ اسپتال کے باغ میں وہ چل پھر سکتا تھا۔

علی اکبر سے چھوٹے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دو دن اور رُک جاؤ۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب جانے کی اجازت دے دیں گے لیکن وہ اسی دن اسپتال سے جانا چاہتا تھا۔ آخر کیوں؟

اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ اس کے پاس کسی کی امانت تھی جسے وہ جلد از جلد پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ دوبئ میں ایک اسٹور میں کام کرتا تھا۔ اس اسٹور کے مالک نے اسے ایک بکس دیا تھا جسے اسٹور کے مالک کے بھائی کے گھر پہنچانا تھا۔

جب وہ دوبئ سے چلا تھا تو یہ امانت پہنچانے کے لیے اس کے پاس پچیس دن تھے لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ جب وہ لاہور ائیر پورٹ سے رکشے میں بیٹھ کر روانہ ہوا تو ابھی نصف راستہ بھی طے نہ ہوا تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک ٹیکسی رکشے سے ٹکرا گئی اور وہ رکشے سے نکل کر سڑک پر گر پڑا۔ زخموں سے اس کا بُرا حال تھا، مگر اس بُری حالت میں بھی اس نے بکس کو دونوں ہاتھوں سے تھامے رکھا اور ایک لمحے کے لیے بھی اسے نہ چھوڑا۔

اُدھر سے ایک کار جا رہی تھی۔ کار والے نے اپنی کار فوراً روک لی، زخمی علی اکبر کو کار میں بٹھایا اور اسے قریبی اسپتال میں پہنچا دیا۔ ڈاکٹروں نے اس کی مرہم پٹی کی اور اس کی حالت بہتر ہونے لگی لیکن جب تک وہ امانت اس شخص کے حوالے نہ کر دے، جس کے لیے یہ دی گئی تھی، اس کی بے چینی دُور نہیں ہو سکتی تھی۔

علی اکبر کو اسٹور کے مالک نے بکس دیتے ہوئے کہا تھا: ''دیکھو بیٹا، تم جانتے ہو کہ میں بیمار ہوں۔ سفر کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ پھر اسٹور چلانے کی ذمے داری تمہارے سپرد نہیں کی جا سکتی کیوں کہ تم ابھی ناتجربہ کار ہو۔ لاہور میں میرے سگے بھائی کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے۔ مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے اور میں کپڑے، زیورات اور

کچھ رقم دے کر ہی اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ علی اکبر بیٹا، مجھے تم پر پورا پورا اعتماد ہے۔ یہ فرض تم بڑی اچھی طرح ادا کر سکتے ہو۔"

اور علی اکبر نے جواب دیا تھا۔

"میں بڑی خوشی سے یہ فرض ادا کروں گا۔ جو کچھ بھی آپ مجھے دیں گے، آپ کے بھائی کے گھر جا کر ان کے حوالے کر دوں گا۔"

اس کے یہ الفاظ سن کر اسٹور کا مالک خوش ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔" اور اس نے اپنے بھائی کے نام ایک رقعہ لکھ کر علی اکبر کے حوالے کر دیا تھا۔ اگر علی اکبر اس حادثے میں زخمی ہو کر اسپتال نہ پہنچ جاتا تو وہ امانت دے کر اپنے گاؤں جاتا اور رشتے داروں سے مل کر دوبئی واپس چلا گیا ہوتا مگر اس حالت میں وہ اپنا فرض کیوں کر ادا کر سکتا تھا۔ یہی اس کی بے قراری کی وجہ تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ امانت اسٹور کے مالک کے بھائی تک کس طرح پہنچائے؟ جب وہ دوبئی کے ایئرپورٹ کی طرف جا رہا تھا تو اسٹور کے مالک نے اسے بتایا تھا۔ "میری بھتیجی کی شادی اس مہینے کے آخری ہفتے میں ہو گی۔ ابھی کافی دن پڑے ہیں۔ یہ چیزیں جلد وہاں پہنچا دی جائیں گی تو شادی کے انتظامات میں آسانی رہے گی۔" اور علی اکبر خوب جانتا تھا کہ مہینے کا آخری ہفتہ ایک دن کے بعد شروع ہونے والا ہے۔

"یہ امانت آج ہی وہاں پہنچ جانی چاہیے۔" اس کی اپنی خواہش تو یہی تھی لیکن یہ خواہش پوری کیوں کر ہو سکتی تھی؟

اس نے ایک بار پھر سیڑھیوں سے نیچے اتر کر نہ صرف باغ کا چکر لگایا بلکہ اسپتال کے بڑے دروازے سے بھی نکل کر چند قدم آگے چلا اور پھر واپس آ گیا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ چلنے پھرنے میں اسے کوئی دقت تو نہیں ہو گی اور اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اسے ذرا بھی تکلیف نہیں ہو گی۔

"میں آسانی سے چودھری ارشاد کے گھر جا سکتا ہوں۔" اس نے دل میں کہا۔ چوہدری ارشاد اسٹور کے مالک کے بھائی کا نام تھا جہاں اسے امانت پہنچانی تھی۔

وہ سیڑھیوں کی طرف چلتے چلتے رُک گیا۔ پانی کی ایک بوند اس کی ناک پر پڑی تھی۔ اس نے اوپر دیکھا، فضا میں بادل تیر رہے تھے اور دُور بادلوں میں سے پھیکا سا سورج نمایاں ہو رہا تھا۔ "ابھی بارش نہیں ہو گی۔" یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گیا۔

وہ اپنے بیڈ پر گیا تو اس کے قریب لیٹا ہوا ایک بوڑھا بیمار اپنا سر ہلاتے ہوئے گویا کہہ رہا تھا۔ "میں جانتا ہوں تمہاری حالت کیا ہے۔" علی اکبر مسکرایا تو وہ بولا۔ "بڑی فکر ہے، امانت پہنچانے کی؟" وہ جانتا تھا کہ علی اکبر کیوں بے چین ہے۔ علی اکبر نے سر ہلا دیا۔

"جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔ ڈاکٹر صاحب نے تمہیں چلنے پھرنے کی اجازت دے دی ہے۔"

علی اکبر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وارڈ میں اس وقت کوئی نرس نہیں

تھی۔ اس نے سرہانے کے پاس رکھے ہوئے اسٹول پر سے بکس اٹھایا تو اسی وقت نرس آگئی۔ اس نے علی اکبر کو جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ”جلدی آ جانا، یہ بہت ضروری ہے۔ ابھی تمہاری حالت اس قابل نہیں ہے کہ زیادہ دیر تک چلو پھرو۔“ علی اکبر نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جلد ہی واپس آ جائے گا۔

تانگے کا انتظار کرنے کی بجائے وہ پیدل ہی چل پڑا۔ وہ اگرچہ ایک گاؤں کا رہنے والا تھا مگر اس نے تعلیم لاہور میں پائی تھی۔ اس لیے اس شہر کے تمام دروازوں سے واقف تھا۔ اسے بھاٹی گیٹ کے اندر بازار حکیماں میں جانا تھا۔ قدم اٹھاتے ہوئے اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے وہ اپنی منزل پر پہنچ جائے۔ بیماری کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ تیز چلنے میں تکلیف ہو رہی تھی، اور دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ بادل زور سے گرجا اور ساتھ ہی بارش ہونے لگی۔

ابھی وہ اسپتال سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ واپس جانے میں کوئی مشکل نہ تھی لیکن اس کے قدم رُک نہ سکے۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ آگے ہی بڑھتا چلا جائے گا، واپس نہیں ہوگا۔

اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا، ہوا تیز ہونے لگی تھی اور بارش میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک جگہ اس نے محسوس کیا کہ اب آگے چلنا مشکل ہے۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگی تھیں۔ کپڑے بھیگ کر بوجھل ہو گئے تھے۔ چند لمحے رُک کر اس نے خود کو سنبھالا اور پھر چلنے لگا۔ اس کا سانس رکنے لگا تھا۔ امانت اس نے اپنے سینے سے لگا رکھی تھی۔

اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ ”اگر میں گر پڑا تو کوئی شخص یہ بکس اٹھالے گا اور میری ساری محنت اکارت جائے گی۔“ اس خیال نے اس کے اندر حرارت سی پیدا کر دی۔ اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔

اب وہ بھاٹی دروازے کے اندر آ گیا تھا۔ اس کی منزل زیادہ دُور نہیں تھی مگر حالت یہ تھی کہ اسے ایک ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر ہو گیا تھا۔ اسی لمحے بارش اور تیز ہو گئی۔ وہ چلتے چلتے رُک گیا۔ اسے کوچہ فقیر خانہ میں جانا تھا مگر وہ یہ نہ جانتا تھا کہ یہ کوچہ کہاں ہے۔

اچانک اس سے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی رُکی۔ اس نے گاڑی کی تیز روشنی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

”مجھے چوہدری ارشاد.....“ اس نے اپنا فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ گاڑی والے نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔ ایک منٹ کے بعد وہ ایک دومنزلہ مکان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور ایک صاحب دروازے پر آئے۔

”آپ کا نام چوہدری ارشاد احمد ہے؟“ علی اکبر نے پوچھا۔

”جی ہاں، فرمایئے!“ انہوں نے کہا۔

علی اکبر نے کچھ کہے بغیر بکس ان کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ چوہدری ارشاد احمد نے سوال کیا۔

”یہ آپ کی امانت ہے۔ دوبئی سے آپ کے بھائی چوہدری نیاز احمد نے بھیجی ہے۔“ علی اکبر نے بتایا۔

چوہدری ارشاد نے بکس لے کر کہا۔ ”شکریہ! اندر آ جایئے۔ بُری طرح بھیگ گئے ہیں۔“

”معاف کیجیے، میرے پاس وقت نہیں ہے۔“ علی اکبر بولا۔

”جی؟“ چوہدری ارشاد احمد کو اس کی بات سن کر حیرت ہوئی۔

”دیکھیے، امانت آپ تک پہنچانا میرا ایک فرض تھا۔“ علی اکبر کہنے لگا۔ ”ابھی مجھے اپنا دوسرا فرض ادا کرنا ہے۔ اسپتال سے آ رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اسپتال سے زیادہ دیر باہر رہنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ مہربانی کر کے مجھے اپنا یہ دوسرا فرض ادا کرنے دیجیے۔“

بارش تھم چکی تھی، مگر ہوا کے تیز و تند جھونکے چل رہے تھے اور علی اکبر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا، اسپتال کی طرف جا رہا تھا!

☆☆

کن پیڑے (Mumps)

یہ ایک معمولی بیماری ہے، جس کا اثر چند دنوں تک مریض کو رہتا ہے۔ اس مرض سے بخار تو ہوتا ہے لیکن اس کا درجہ حرارت زیادہ نہیں ہوتا۔ اس مرض سے بچے کھانے پینے کی چیز کو مشکل سے گلے سے نیچے نگلتے ہیں۔ اس مرض کی علامات بہت آسان ہیں۔ گلے کے نیچے کے غدود سوج جاتے ہیں اور اس سوجن کی وجہ سے درد محسوس ہوتا ہے اور گردن اکڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ سر میں درد، جسم میں تھکاوٹ اور گلے کا خراب ہونا اس کی خاص نشانیاں ہیں۔ نبض بہت آہستہ ہو جاتی ہے۔ یہ چھوت کی بیماری ہے، لہٰذا دوسروں کو احتیاط کرنی چاہیے اور مریض کو الگ رکھنا چاہیے۔ کم از کم مریض کو دس روز تک بیڈ ریسٹ دیں۔ مریض کو سادہ غذا مثلاً جیلی، سا گودانہ وغیرہ استعمال کرنی چاہیے۔ چہرے اور گردن کے سوجے ہوئے حصوں پر گرم پانی سے ٹکور کر کے درد میں کمی محسوس کی جا سکتی ہے۔

اپنی ملت پہ قیاس....

ازکی اخلاق بٹ

شہر کے معروف انگلش میڈیم اسکول فار بوائز میں پروفیسر صدیق رضا کا بحیثیت استاد یہ پہلا دن تھا۔ چونکہ ان کی تعلیمی قابلیت میں ایم۔ اے اُردو بھی شامل تھا، سو انہیں چھٹی سے دسویں جماعت تک کے طلباء کو اُردو پڑھانے کا ذمہ سونپا گیا جسے انہوں نے خوش دلی سے قبول کر لیا۔ اسمبلی کے بعد ان کے پہلے دو پیریڈ فری تھے۔ تیسرا پیریڈ ان کا دہم اے میں تھا جہاں انہیں طلباء کو اُردو پڑھانا تھی۔ جب وہ جماعت میں داخل ہوئے تو یک دم خاموشی چھا گئی۔

"گڈ مارننگ سر" کہتے ہوئے لڑکے ان کے احترام میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر طالب علم اپنی جگہ پر بالکل سیدھا، چست اور ہوشیار کھڑا تھا۔ کسی کے بھی انداز سے سستی یا لاپروائی ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ یہ سب باتیں جماعت کے منظم ہونے کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

"گڈ مارننگ کے ساتھ ساتھ اگر آپ لوگ السلام علیکم بھی کہہ دیا کریں تو زیادہ مناسب رہے گا کیوں کہ ایک طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ایک مسلمان بھی تو ہیں ناں۔" پروفیسر صدیق رضا اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے اور ساتھ ہی طلباء کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ان کی اس تاکید پر لڑکے کچھ حیران سے ہو گئے کیوں کہ شہر کے اس معروف اسکول میں پڑھانے والے ان کے ہر استاد نے ان کے اس انگریزی طرزِ عمل کو ہمیشہ سراہا تھا۔

"میرا نام صدیق رضا ہے۔ آج سے میں آپ لوگوں کو اُردو پڑھاؤں گا۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ درس و تدریس کا یہ سلسلہ دوستانہ ماحول میں جاری رکھا جائے۔ آپ کو اُردو کے علاوہ بھی جب کبھی مجھ سے مدد لینی ہو یا سبق سے متعلقہ نکات آپ کی سمجھ میں نہ آئیں تو آپ بلاجھجک مجھ سے کہہ سکتے ہیں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کروانے کے بعد طلباء کا اعتماد بحال کرنے کے لیے یہ جملے کہے۔ پروفیسر صاحب کی اس بات پر طلباء کافی مطمئن نظر آنے لگے لیکن کچھ لڑکوں سے پروفیسر صاحب کی "اُردو" ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"جی تو اب آپ لوگ اپنا تعارف کروائیں۔" انہوں نے خوش دلی سے پہلی رو میں بیٹھے لڑکے کی طرف اشارہ کیا، پھر فرداً فرداً پوری جماعت نے اپنا تعارف کروایا لیکن ایک بات پروفیسر صاحب کو بہت چبھی کہ تقریباً ساری جماعت نے اپنا تعارف انگریزی میں کروایا تھا۔ پروفیسر صاحب کو اُردو کے پیریڈ میں انگریزی کا مظاہرہ بہت ناگوار گزرا لیکن وہ خاموش رہے۔

"بچو! اب آپ اپنی کتابیں کھول لیں۔" انہوں نے میز سے اُردو کی کتاب اُٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر انہوں نے ایک طالب علم کو اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر سبق بلند آواز سے پڑھنے کو کہا۔ اس بات پر لڑکے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ انہیں اس نوعیت کے استاد سے پہلی بار پالا پڑا تھا جو جدید تعلیم سے آراستہ ہونے کے باوجود پڑھانے کے پرانے طریقوں پر کاربند تھا۔ ان کے اُردو کے پہلے استاد نے انہیں کبھی اس انداز

میں نہیں پڑھایا تھا۔ وہ بس سبق پر نشان لگوا کر یاد کرنے کا حکم دے کر خود کو بری الذمہ تصور کرتے تھے کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ دہم جماعت کے طلباء اتنے چھوٹے نہیں ہوتے کہ انہیں بچوں کی طرح پڑھایا جائے۔ ان کے اس خیال کی نفی اس وقت ہوئی جب دسمبر ٹیسٹ میں جماعت کے پینتیس طلباء میں سے سات اُردو میں فیل ہو گئے جب کہ انہی طالب علموں کا دوسرے مضامین میں رزلٹ A گریڈ تھا۔ شہر کے اس معروف اسکول کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ پروفیسر صدیق رضا جن کے حکم پر طالب علم کھڑا ہو کر ذرا اونچی آواز سے سبق پڑھنے لگا تھا مگر پروفیسر صاحب کو اس وقت سخت حیرانی ہوئی جب دہم جماعت کا وہ لڑکا اُردو کے بعض آسان الفاظ کو بھی درست تلفظ سے ادا نہ کر سکا۔ انہوں نے تقریباً ساری جماعت سے اُردو کی اونچی آواز میں پڑھائی کروائی۔ بظاہر اتنے اچھے اور معیاری اسکول کے طالب علم اپنی قومی زبان اُردو سے ایسے نابلد تھے کہ دسویں جماعت میں آجانے کے باوجود اُردو کو روانی اور درست تلفظ کے ساتھ پڑھنے سے قاصر تھے۔ انہیں استاد رکھتے ہوئے یہ تو بتایا گیا تھا کہ دہم جماعت کے طلباء کی اُردو کچھ اتنی خاص نہیں ہے۔ انہیں اُردو پڑھنے اور لکھنے میں کچھ مشکلات کا سامنا ہے کیوں کہ انہیں اچھا استاد میسر نہیں ہوا لیکن پروفیسر صاحب کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی اُردو اتنی خراب ہو سکتی ہے۔ پوری جماعت میں سے صرف ایک لڑکا سبق کو درست تلفظ کے ساتھ پڑھنے میں کامیاب ہوا۔ اب ان کے پاس اس جماعت کو اُردو کی تیاری کروانے کے لیے صرف تین ماہ تھے۔

''بہت زیادہ محنت کرنا پڑے گی آپ لوگوں پر۔ خیر سبق تو ہم نے پڑھ لیا ہے، اگر آپ میں سے کوئی اس کے متعلق کچھ پوچھنا چاہے تو پوچھ سکتا ہے۔''

"Sir, May I ask a question? please!"

انہوں نے چونک کر اس جانب دیکھا جہاں سے یہ آواز آئی تھی۔ یہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا تھا جو بڑے اعتماد سے ان سے سوال کر رہا تھا۔

''جی پوچھیے۔'' انہوں نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ پرانے زمانے کے کوئی بہت بوڑھے استاد تھے جنہیں انگریزی زبان سے آشنائی نہیں تھی بلکہ وہ درمیانی عمر کے ایک اچھی شخصیت کے مالک، پڑھے لکھے استاد تھے جو نہ صرف جدید عصری علوم سے آشنا تھے بلکہ ضرورت پڑنے پر ان کا درست استعمال کرنا بھی بخوبی جانتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی روایات اور ملک سے پیار کرنے والے ایک سچے محب وطن تھے جو قوم کی بہتری اور ترقی کے لیے اس کی شناخت کا قائم رہنا ضروری خیال کرتے تھے اور ظاہر ہے کسی قوم کی شناخت اس کی زبان اور انداز و اطوار سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی قوم اپنی زبان اور بود و باش کا ہی تحفظ نہ کر سکے تو وہ بہت جلد صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ یہی چند وجوہات پروفیسر صدیق رضا کو مغربی انداز و اطوار اختیار کرنے سے روکتی تھیں۔

"Sir, I want to ask that..." اور اس کے بعد اس طالب علم نے اپنا پورا سوال انگریزی میں ہی دہرایا۔ انہوں نے اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے اس طالب علم کا جائزہ لیا جو اپنا سوال دہرانے کے بعد بڑے اطمینان سے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اعتماد اور کسی قدر فخر تھا۔ قابلِ غور بات یہ تھی کہ یہ طالب علم بھی انہی میں سے تھا جو اُردو پڑھنے میں ناکام ثابت ہوئے تھے اور اس طرح روانی سے انگریزی بولتے ہوئے یکسر مختلف نظر آرہا تھا۔ شاید اس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے سوال کیا تھا اور پھر اس کے بعد بھی جتنے طالب علموں نے سوال کیے، انگریزی ہی میں کیے۔ پروفیسر صدیق رضا کا دل دکھ سے بھر گیا۔ یہ نوجوان اغیار کے رنگ میں اتنا رنگ چکے ہیں کہ اپنے ملک کی روایات، ثقافت اور زبان سب کچھ فراموش کیے بیٹھے ہیں۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے طلباء کے سوالات کے جوابات دینے لگے مگر اسی اثناء میں پیریڈ ختم ہونے کی بیل ہوئی تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

☆

اگلے دن ''گڈ مارننگ سر، السلام علیکم سر'' کی ملی جلی آوازیں ان کے جماعت میں داخل ہونے پر بلند ہوئیں۔ اگرچہ السلام علیکم کی آواز بہت کم تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ پروفیسر صاحب کی ہدایت پر عمل صرف چند ایک لڑکوں نے ہی کیا تھا لیکن پھر بھی وہ خوش تھے کہ ابھی بھی اس قوم کے نوجوان صحیح بات کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوئے۔

''وعلیکم السلام! پیارے بچو، بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے شفقت سے کہتے ہوئے ہاتھ سے بچوں کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

''تھینک یو، سر!'' پوری جماعت یک زبان ہو کر بولی۔

''ایک منٹ بچو! آج میں پڑھانے سے پہلے آپ لوگوں سے چند ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔'' بچوں کو کتابیں کھولتے دیکھ کر وہ بولے۔ سوال کا سن کر لڑکوں نے سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں میں فطری تجسس سا تھا کہ آخر سر کیا پوچھنے والے تھے۔

"اچھا! یہ بتائیے کہ آپ لوگوں میں سے اُردو کس کا پسندیدہ مضمون ہے؟" ان کے اس سوال پر پینتیس لڑکوں میں سے صرف ایک نے ہاتھ اٹھایا۔

"جی، تو بیٹا! آپ یہ بتائیں کہ آپ کو اُردو کیوں پسند ہے؟" انہوں نے دل کی ذہنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ اس لیے سر کہ اُردو ایک آسان مضمون ہے اور اس میں تھوڑی سی محنت کر کے زیادہ نمبر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔" وہ جو بڑی امید سے اس طالب علم کی طرف دیکھ رہے تھے کہ ضرور وہ کوئی ایسا جواب دے گا کہ "سر مجھے اُردو اس لیے پسند ہے کہ یہ ہماری قومی زبان ہے۔ ہماری پہچان، ہماری شناخت اور ہماری جداگانہ حیثیت کی ضامن۔" مگر اس نے اتنا سطحی جواب دیا کہ ان کا دل بجھ گیا۔

"اچھا تو اب یہ بھی بتا دیں کہ پسندیدہ ملک کون سا ہے؟"

انہیں یقین تھا کہ اب کی بار طلباء زیادہ تر پاکستان کا نام لیں گے کیوں کہ اپنی دھرتی سے محبت تو ہر شخص کے خمیر میں شامل ہے مگر اب کی بار بھی انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا کیوں کہ طلباء کے جوابات امریکہ، برطانیہ اور جرمنی وغیرہ پر مشتمل تھے۔ یہ سب سن کر پروفیسر صاحب بے حد دلبرداشتہ ہوئے۔ کتنی ہی دیر تک وہ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ طلباء ان کے اس رویے پر حیران تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر پروفیسر ان کی کس بات پر افسردہ تھے۔ اپنی دانست میں تو انہوں نے دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک کو اپنا پسندیدہ ملک قرار دے کر بہت اچھا جواب دیا تھا۔

"کیا ہوا سر؟" انہیں افسردہ دیکھ کر کلاس مانیٹر ان سے دریافت کر رہا تھا۔

"کچھ نہیں بیٹا! بس اس ملک کی حالت زار پر افسوس کر رہا ہوں جس کے نوجوان اپنے ملک کی کسی بھی بات کو آئیڈیلائز (Idealize) نہیں کرتے۔" ان کے چہرے پر بڑی پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

"Sorry to say, sir!" لیکن اس ملک میں ایسا ہے ہی کیا کہ اس پر فخر کریں۔ بدعنوانی، دہشت گردی، غربت، بے روزگاری، جہالت کے سوا کیا ہے یہاں؟ پھر بھی آپ یہ کہتے ہیں کہ ہم پاکستان پر فخر کریں، آخر کس بات پر سر۔۔۔ کس بات پر؟" ایک جذباتی قسم کا لڑکا اٹھ کر زور و شور سے بولنے لگا۔ شاید اس کا ذہن اس بات تک نہیں پہنچ سکا کہ پاکستان نے اسے اور کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو لیکن آزادی ضرور دی تھی۔ وہی آزادی جس کی بنیاد پر وہ پاکستان ہی کی سرزمین پر کھڑا اسے کوس رہا تھا اور اس کی بُرائیاں گنوا رہا تھا۔ اس لڑکے کی باتیں سن کر پروفیسر صاحب کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرایا۔

"آپ نے بڑی آسانی سے اس ملک کی بُرائیاں گنوا دی ہیں لیکن شاید آپ کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہے کہ اس چھوٹے سے زمین کے خطے کو حاصل کرنے کے لیے لاکھوں قربانیاں دی گئی ہیں۔ اگر آپ کو ان قربانیوں کا تھوڑا سا بھی اندازہ ہوتا تو شاید آپ یہ بات نہ کہتے۔ آپ نے کہا کہ دُنیا کی ہر بُرائی پاکستان میں پائی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ بُرائیاں پاکستان کی پیدا کردہ ہیں؟ اس بے جان در و دیوار سے بنے ملک کی جو مسلمانوں کے تحفظ اور بقاء کے لیے بنایا گیا؟ نہیں۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔ ان تمام بُرائیوں کا ذمہ دار پاکستان نہیں بلکہ پاکستان کے رہنے والے لوگ ہیں۔ کوئی بھی ملک اپنے رہنے والوں کی وجہ سے اچھا یا بُرا تصور کیا جاتا ہے۔ جیسا طرزِ عمل وہ اپنائیں گے، اس کی بناء پر وہ ملک اچھا یا بُرا کہلائے گا۔ اگر کوئی قوم اپنے ملک و ریاست کی وفادار ہے، اس کی ثقافت و روایات کو اختیار کیے ہوئے ہے، اپنی قومی زبان، خواہ وہ کتنی ہی پسماندہ کیوں نہ ہو، بولنے میں جھجک محسوس نہیں کرتی، اپنے ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دیتی ہے، ملک و قوم پر کیسا ہی وقت کیوں نہ آ جائے، اس کی وفادار رہتی ہے اور ہر طرح کی قربانی دینے کا جذبہ رکھتی ہے تو بلاشبہ وہی قوم ایک اچھی قوم کہلانے کی حق دار ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی قوم نہ تو اپنی روایات، رسومات اور ثقافت کو اختیار کرتی ہے اور نہ اپنی قومی زبان بولنے میں فخر محسوس کرتی ہے بلکہ اغیار کے بتائے ہوئے غلط راستوں پر سرپٹ دوڑتی ہے، مشکل حالات میں اپنے ملک کے لیے چھوٹی سی قربانی دینے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتی تو ایسی قوم ہرگز ایک اچھی قوم کہلانے کی حق دار نہیں۔

سب سے بُری لت جو نوجوانوں کو لگ چکی ہے، وہ غیروں کی زبان اور انداز اپنانے پر فخر محسوس کرنا ہے۔ اگر کوئی کسی کو روانی سے انگریزی بولتا دیکھ لے تو اس سے سخت مرعوب ہو جاتا ہے، یوں جیسے موجودہ صدی کا ارسطو دیکھ لیا ہو۔ اس کے برعکس اُردو بولنے والوں کو تو دقیانوسی تک کہہ دیا جاتا ہے۔ نوجوان قائداعظم کے نزدیک مستقبل کے معمار ہیں جن کے لیے شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے شاہین کا لفظ استعمال کیا۔ ہمارے اسلاف نے ہمیں بارہا مغرب کی اندھی تقلید سے منع کیا ہے اور ہمیں یہ باور کروانا چاہا ہے کہ ہم ایک اچھی قوم ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہم اپنی قومی زبان بولنے سے گریز

کیوں کرتے ہیں، حالاں کہ یہ بھی نہیں کہ اُردو اس دُنیا کی کوئی پسماندہ یا ترقی پذیر زبان ہے۔ اُردو زبان روز افزوں ترقی کرتی جا رہی ہے اور اس کا شمار دُنیا کی بڑی زبانوں میں ہوتا ہے۔ اُردو زبان کو اپنائیں کیوں کہ انسان کی اصل شناخت اس کی زبان اور انداز و اطوار سے ہوتی ہے۔" جماعت میں اتنی جامد خاموشی تھی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی۔ طلباء کے سر شرمندگی سے جھکے چلے جا رہے تھے۔ انہیں آج پہلی بار اس بات کا احساس ہوا تھا کہ وہ جو مغرب کی تقلید پر فخر محسوس کرتے تھے، درحقیقت یہ بات قابلِ فخر نہیں بلکہ قابلِ مذمت تھی کہ وہ اپنی شخصیت کی پہچان اپنی زبان اور ثقافت کے بجائے اغیار کی زبان و ثقافت کے ذریعے کروانا چاہتے تھے۔ "لیکن سر! اگر ہم انگریزی نہیں سیکھیں گے تو ترقی کیسے کر پائیں گے کیوں کہ سر انگریزی دُنیا کی سب سے ترقی یافتہ زبان ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارا نصاب بھی انگریزی میں ہے؟" ایک لڑکا چہرے پر اُلجھن لیے سوال کرنے لگا۔

"میری کسی ایک بات کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم انگریزی سیکھیں ہی نہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ ہمیں دُنیا بھر کی زبانوں پر عبور حاصل ہونا چاہیے۔ ان تمام زبانوں کو سیکھنے کا مقصد اپنے ملک و قوم کی بھلائی و ترقی ہو۔ جہاں تک بات ہے انگریزی زبان سیکھ کر ترقی کرنے کی تو پیارے بچو اس غلط فہمی کو ذہن سے نکال دو کہ انگریزی سیکھے بغیر ہم دُنیا میں ترقی نہیں کر سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان اگر اپنی ثقافت کو اختیار کرے اور زبان کو زندگی کے ہر میدان میں استعمال کرے، خواہ وہ تعلیم کا شعبہ ہی کیوں نہ ہو، انسان ضرور ترقی کرتا ہے کیوں کہ مقصد تو علم حاصل کرنا ہوتا ہے اور وہ تو انسان کسی بھی زبان میں کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر جاپان اس وقت ترقی یافتہ قوموں اور ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن ان کا سارا نصاب ان کی اپنی زبان میں ہے۔ دُنیا میں کئی ایسے ممالک ہوں گے جو اپنی زبان کو ہر شعبے میں ترجیح دیتے ہوں گے، باقی زبانیں سیکھنے کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم دُنیا کی ہر قوم اور ہر ملک سے ترقی میں دو قدم آگے ہی ہوں، کسی بھی میدان میں ہم ان سے پیچھے نہ رہیں بلکہ مسلسل جدوجہد سے انہیں پیچھے چھوڑ دیں۔ بچو! علم سیکھو مگر علم کو حاصل کرنے کے بعد اپنے ملک و قوم کی خدمت کرنا اور ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں اپنا کردار ادا کرنا مت بھولیے گا۔

ایک آخری بات پاکستان نے ہمیں "کچھ" نہیں دیا بلکہ "سب کچھ" دیا ہے اور اب دینے کی باری ہماری ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنی بات کا اختتام کیا۔ وہ جان گئے تھے کہ طلباء نے ان کی باتوں کو دل پر نقش کر لیا ہے، سو وہ اطمینان کے ساتھ جماعت سے باہر چلے آئے۔

اپنی ملت پہ قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

انسائیکلوپیڈیا کی تاریخ

آج کے سائنسی دور میں کمپیوٹر کے ذریعے کسی بھی چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنا آسان ہوگیا ہے۔ بہت سی ویب سائنس جیسے Google اور Wikipedia اسی مقصد کے لیے کام کر رہی ہیں لیکن بہت سے لوگ یہ نہیں جانتے کہ اس کی بنیاد کا سہرا بھی مسلمانوں کے سر ہے۔

جی ہاں! ہم بات کر رہے ہیں امام ذہبی اور ابنِ خلدون کی اور ان کے بعد آنے والے امام رازی کی جنہوں نے اپنی کتب انسائیکلوپیڈیا کے طرز پر لکھیں جس سے آج تک نسل انسانی استفادہ حاصل کرتی آئی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کی تاریخ 20,000 سال پرانی ہے لیکن اس کا کوئی بھی ریکارڈ اب دنیا میں موجود نہیں، نہ ہی وہ اتنا معیاری تھا کہ اس سے معلومات حاصل کرنا ممکن ہوتا۔ اگر ہم امام ذہبی کی کتاب تاریخِ اسلام دیکھیں تو ہمیں حیرت ہوگی کہ آج سے سات سو سال پہلے وہ کتاب Wikipedia کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس میں تمام معلومات حروف تہجی کی بناء پر لکھی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے حضرت عمر خطابؓ کے بارے میں جاننا ہے تو آپ ع سے بننے والے تمام ناموں میں عمر کو ڈھونڈیں گے اور پھر تمام عمر میں عمر خطابؓ کو۔ اسی طرح ابنِ خلدون کی کتاب مقدمہ اور کتاب العبر بھی تاریخ کی بہترین کتابیں ہیں اور ان میں تمام معلومات انتہائی تفصیل سے بیان ہیں۔ یہ کتب آج بھی موجود ہیں اور پوری دنیا میں تاریخی معلومات کے لیے اہم ذریعہ ہیں۔ سترہویں صدی تک مسلمانوں کی کتب کو ہی مستند سمجھا جاتا رہا۔ اٹھارویں صدی میں ایک فرانسیسی Diderot نے انسائیکلوپیڈیا کے نام سے پہلی کتاب لکھی، اس کے بعد سے مغرب میں اس موضوع پر کام ہوا جو اب تک جاری ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے سر پر جدید انسائیکلوپیڈیا ایجاد کرنے کا سہرا موجود ہے اور یہ ہمارے آباء و اجداد کا کارنامہ ہے۔

صائمہ نثار، ملتان

میری بیاض

سہارا جو کسی کا ڈھونڈتے ہیں بحرِ ہستی میں
سفینہ ایسے لوگوں کا ہمیشہ ڈوب جاتا ہے

(مریم صدیقہ راجپوت، گوجرانوالہ)

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

(عائشہ عزیز، ڈیرہ اسماعیل خان)

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

☆

زباں تیغ رواں بننے نہ پائے
زباں کے زخم کا مرہم نہیں ہے

(محمد عبداللہ ثاقب، پشاور)

منہ چھپا کے جیئے نہ سر جھکا کے جیئے
ستم گروں کی نظروں سے نظریں ملا کے جیئے
اک رات کم جیئے تو کیا ہوا
ہم ان کے ساتھ تھے جو مشعلیں جلا کے جیئے

☆

خدارا نہیں ہے تیرا کوئی ثانی
تو قائم ہمیشہ یہ دنیا ہے فانی
ہر ایک چیز کُن سے ہے تو نے بنائی
اور حکمت سے ہر شے بھی تو نے سجائی

(ملک مختار، فاطمۃ الزہراء)

مدتیں جو بھی ملاقات تھی ادھوری تھی
کہ ایک چہرے کے پیچھے ہزار چہرے تھے

☆

ہم نیند کے شوقین زیادہ نہیں، لیکن
کچھ خواب نہ دیکھیں تو گزارہ نہیں ہوتا

خبر سن کر مرے مرنے کی، وہ بولے رقیبوں سے
خدا بخشے، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

☆

کون سا قہر یہ آنکھوں پہ ہوا ہے نازل
ایک مدت سے کوئی خواب نہ دیکھا ہم نے

(محمد قمر زمان، خوشاب)

احساس کے انداز بدل جاتے ہیں ورنہ
آنچل بھی اسی تار سے بنتا ہے کفن بھی

☆

میں شکستہ ہو گیا ہوں وقت تیرے ہاتھ سے
میرا ساتھ چھوڑ دے یا کھل کے میرا ساتھ دے

☆

نہ گھبرا کثرت غم سے حصول کامیابی میں
شاخِ گل میں پھول آنے سے پہلے خار آتے ہیں

(محمد حمزہ سعید، فیصل آباد)

نکالا ہم کو جنت سے فریب زندگی دے کر
دیا پھر ذوق جنت کیوں؟ یہ حیرانی نہیں جاتی

☆

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

☆

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں؟
فکرِ فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

(سید شہریار، لاہور)

اے دوست دل میں گردِ کدورت نہ چاہیے
اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہیے

(سید ذوالفقار حسین نقوی، کراچی)

☆☆☆

رات کو طارق کی ماں کام سے فارغ ہو کر آئی تو طارق نے کہا۔

''ماں میں جعفر کے ساتھ اس کے گھر چلا جاؤں؟''

''کیوں؟'' ماں نے جلدی سے پوچھا۔

''جعفر نے آج مجھے کئی بار گھر چلنے کے لیے کہا ہے۔'' یہ سن کر ماں سوچ میں پڑ گئی۔

طارق نے کہا۔''اور فریدہ بھی کہتی تھی کہ جعفر کے گھر چلو۔''

''کیا فریدہ بھی ساتھ جائے گی؟'' ''جی ہاں۔''

''تو پھر کوئی حرج نہیں تم بھی چلے جانا۔''

''چلا جاؤں؟'' طارق نے پوچھا اور ماں کو کچھ اور خیال آ گیا۔ اس کا دل کانپ اٹھا۔

''نہیں بیٹا۔'' ماں گھبرا کر جلدی سے بولی۔ اس کے گھر مت جانا۔ اس کا باپ تمہارا دشمن ہے۔''

''پھر فریدہ جو کہتی ہے!'' طارق نے کہا۔

''بیٹے! فریدہ کو کیا معلوم کہ جعفر کا باپ ہمارے خون کا پیاسا ہے۔ وہ تو اپنے ماں باپ کی طرح نیک اور سیدھی بچی ہے۔''

''میں اگر جعفر کے ساتھ نہ گیا تو فریدہ ناراض ہو جائے گی۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں اسے منا لوں گی۔'' ماں نے جواب دیا۔

اگلے دن چھٹی ہوتے ہی جعفر نے طارق کو اپنے گھر چلنے کے لیے کہا۔ طارق نے انکار کر دیا۔ جعفر نے فریدہ سے کہا۔

''فریدہ! تم اسے سمجھاؤ۔ یہ تمہاری ہر بات مان لیتا ہے۔''

فریدہ نے طارق سے کہا۔''چلے چلو طارق! بے چارہ جعفر کل سے کہہ رہا ہے، تھوڑی دیر میں واپس آ جائیں گے۔''

''مجھے گھر پر کام ہے فریدہ۔''

''ہوں! کام کا بہانہ کر رہے ہو۔'' فریدہ نے کہا۔

''آؤ، چلو!''

''تم چلی جاؤ فریدہ!'' طارق نے کہا۔

''تم میری بات بھی نہیں مانو گے؟'' فریدہ بولی۔

''میں...... مجھے...... میں......'' طارق کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

''میں...... میں مت کرو۔'' فریدہ نے کہا اور طارق کا ہاتھ پکڑ کر اسے جعفر کی کار کی طرف کھینچنے لگی۔ جعفر بھی طارق کو پیچھے سے دھکا دینے لگا۔ طارق کو غصہ آ گیا۔ اس نے فریدہ کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور زور سے بولا۔''میں نہیں جاؤں گا۔ میں نہیں جاؤں گا۔''

''جاؤ...... پھر جاؤ۔'' فریدہ کو بھی غصہ آ گیا اور وہ جعفر سے بولی۔

''چھوڑ دو اسے۔ آؤ ہم دونوں چلتے ہیں۔'' فریدہ اور جعفر، جعفر کی گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔

جعفر اور فریدہ موٹر میں جا رہے تھے۔ راستے میں جعفر نے کہا۔

''آج طارق کو کیا ہو گیا ہے؟'' فریدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اداس بیٹھی تھی۔ وہ اداس بھی تھی اور طارق سے خفا بھی۔

''اب طارق تمہارا کہنا بھی نہیں مانتا۔'' جعفر نے کہا۔ ''میرا خیال ہے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

''ہاں۔'' فریدہ ہولے سے بولی۔

''تم نے خود ہی اسے سر چڑھا رکھا ہے۔'' جعفر نے کہا۔ فریدہ کچھ نہیں بولی۔ شام کو جعفر فریدہ کے ساتھ اس کے گھر آ گیا۔ فریدہ کو کوٹھی میں چھوڑ کر وہ طارق کے پاس آیا اور اسے اپنے ساتھ فریدہ کے کمرے میں لے گیا۔ طارق نے سوچا فریدہ چھٹی کے بعد مجھ سے ناراض ہو کر گئی تھی۔ اب میں اسے جا کر منا لوں گا۔

طارق فریدہ کے کمرے میں آیا تو وہ اس وقت کیرم بورڈ سامنے رکھے بیٹھی تھی۔ طارق نے اس سے بات کی لیکن فریدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب طارق نے دیکھا کہ فریدہ اب بھی ناراض ہے تو وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ جعفر طارق کے پیچھے بھاگا اور برآمدے میں اسے روک کر بولا۔ ''طارق! کہاں جا رہے ہو؟''

''واپس اپنے گھر...... فریدہ مجھ سے بات ہی نہیں کرتی۔''

''بات کیوں نہیں کرتی...... تم فکر مت کرو۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ میں رات کو یہیں رہوں گا۔ اور ہاں کل اتوار ہے نا! کل مزے دار پروگرام بنائیں گے۔ ہم تینوں دریا پر چلیں گے۔''

''لیکن فریدہ......'' طارق کہنے ہی لگا تھا کہ جعفر جلدی سے بولا۔

''فریدہ تو کیا، اس کا باپ بھی تم سے بات کرے گا۔ میں ابھی جا کر فریدہ کو سمجھاتا ہوں۔ صبح کو وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔''

طارق کا دل بہت اداس تھا۔ اس نے سوچا۔ ''فریدہ پہلے تو کبھی مجھ سے نہیں روٹھی تھی۔ اب اسے کیا ہو گیا ہے۔ پہلے میں جب اس کے ساتھ نہیں جاتا تھا تو وہ رویا کرتی تھی اور میری ماں سے کہتی تھی۔ اب میں اسے منانے گیا ہوں۔ اس کے ساتھ کھیلنے گیا ہوں تو منہ پھلائے بیٹھی ہے۔ بات نہیں کرتی...... میری طرف دیکھا تک نہیں۔''

''اچھا میں صبح کو تمہیں بلا لوں گا۔'' جعفر نے کہا اور پھر طارق سے ہاتھ ملا کر واپس فریدہ کے پاس چلا گیا۔

آج اتوار تھا۔ صبح ہوتے ہی جعفر کے ابا فریدہ کے گھر آ گئے۔ رات کو جعفر اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ وہ فریدہ کے ہاں سویا تھا۔ فریدہ کے ابا اپنے بھائی کو صبح سویرے اپنی کوٹھی میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ فریدہ کے ابا کو بھی آج چھٹی تھی۔ اتوار کے روز ان کی دکان بند رہتی تھی۔

انہوں نے اپنے بھائی یعنی جعفر کے ابا کے لیے خاص طور پر کئی چیزیں تیار کرائیں۔ ناشتہ تیار ہو گیا تو فریدہ اور جعفر کو بھی بلوا لیا گیا۔ جعفر کے ابا، فریدہ کے ابا، فریدہ کی امی، جعفر اور فریدہ نے مل کر ناشتہ کیا۔

آج ہی طارق کی ماں نے جعفر کے ابا کو قریب سے دیکھا کیوں کہ باورچی خانے میں بوڑھا نوکر کھانے کی چیزیں تیار کر رہا تھا اور طارق کی ماں کھانے پلیٹوں میں سجا کر کھانے کے کمرے میں لا رہی تھیں۔ طارق کی ماں نے تین چار دفعہ جعفر کے ابا کو غور سے دیکھا اور دل میں سوچنے لگیں کہ جعفر کے ابا شکل وصورت سے تو برے نہیں لگتے۔ اس قدر شریف ہیں۔ کتنی اچھی باتیں کرتے ہیں۔

طارق کی ماں کھانے کی میز کے پاس کھڑی تھیں، فریدہ کی امی بولیں۔

''طارق ابھی تک کیوں نہیں آیا۔''

''شاید سو رہا ہو گا۔ آج چھٹی ہے نا۔'' فریدہ کے ابا نے جواب دیا۔

''طارق کون ہے؟'' جعفر کے ابا نے پوچھا۔

''طارق...... آپ طارق کو نہیں جانتے؟'' فریدہ کے ابا نے سوال کیا اور جعفر فوراً بول پڑا۔ ''ابا جان! طارق ہمارے ساتھ پڑھتا ہے۔ میرا بہت اچھا دوست ہے۔''

''اچھا! اچھا!'' جعفر کے ابا نے کہا۔

''بہت اچھا لڑکا ہے۔ بہت ہی شریف اور نیک ہے۔'' فریدہ کی امی بولیں۔

''طارق اور فریدہ ہم عمر ہیں۔'' فریدہ کے ابا نے کہا۔ پھر وہ طارق کی ماں کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

''آپ طارق کی امی ہیں۔''

''اچھا! اچھا!'' جعفر کے ابا نے طارق کی ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''آپ بہت خوش نصیب ہیں جو اتنا نیک اور شریف بیٹا پایا ہے۔ اللہ اس کی عمر دراز کرے۔''

طارق بہت ذہین اور اچھا لڑکا ہے۔ ہم اسے بالکل اپنے بیٹے کی طرح جانتے ہیں۔'' فریدہ کے ابا نے کہا۔

''اچھا! اچھا! یہ تو نیکی کا کام ہے۔'' جعفر کے ابا نے انڈوں کا حلوہ کھاتے ہوئے کہا۔ پھر طارق کی ماں سے کہنے لگے۔

''جعفر بھی ہر وقت آپ کے بیٹے کی تعریفیں کرتا ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ کبھی اسے ساتھ لے کر ہمارے ہاں آیئے۔ جعفر کی امی آپ سے مل کر اور طارق کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔''

''ہاں ضرور جایئے۔'' فریدہ کے ابا نے کہا۔

فریدہ کی امی بولیں۔ ''دو تین روز تک میں آپ کے ہاں
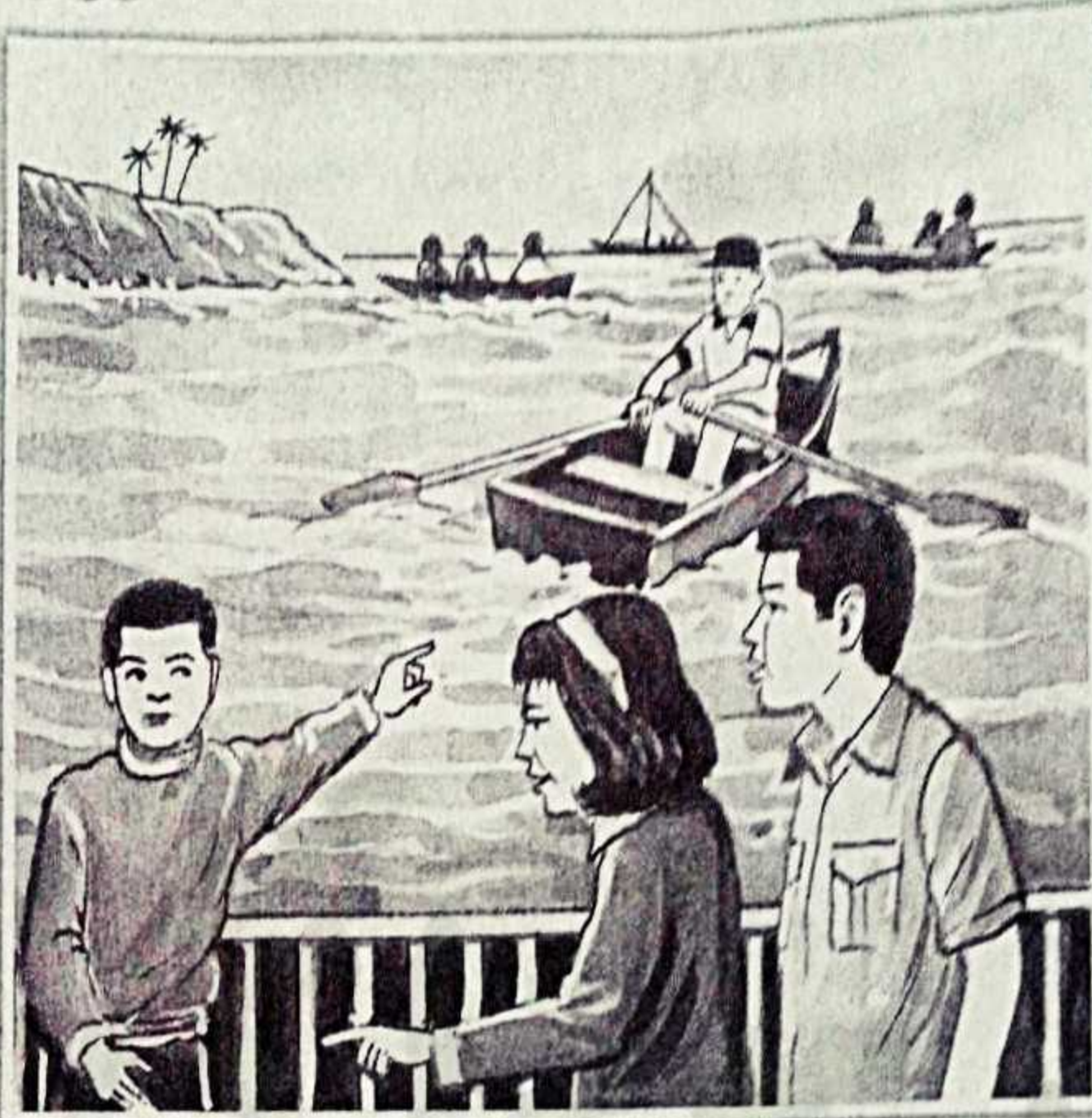
آؤں گی تو انہیں بھی ساتھ لیتی آؤں گی۔''

''بہت اچھا۔'' جعفر کے ابا نے کہا۔

طارق کی ماں دل میں سوچنے لگیں۔ جعفر کے ابا تو اتنے اچھے ہیں۔ بے چارے کتنے شریف ہیں۔ وہ جو دو آدمی میرے طارق کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ انہوں نے غلط کہا ہو گا۔ انہوں نے کسی دشمنی کی وجہ سے جعفر کے ابا کا نام لے دیا ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی اور جعفر ہو اور اس کے باپ نے میرے بیٹے پر ظلم کیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ موٹا آدمی بچے اٹھانے والا ہو اور اس نے میرے بیٹے کے دل میں اعتبار پیدا کرنے کے لیے ایسی باتیں کہہ دی ہوں۔ طارق کی امی سوچ رہی تھیں۔ جعفر کے ابا اتنے امیر آدمی ہیں، پھر اتنے اچھے بھی ہیں۔ انہیں ہم غریب ماں بیٹے سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ اب میز پر سب لوگ میٹھی اور نمکین چیزیں کھانے کے بعد چائے پی رہے تھے۔ جعفر کے ابا نے طارق کی ماں سے کہا۔

''تو پھر آپ ہمارے ہاں آئیں گی نا؟''

''جی..... جی ہاں!'' طارق کی امی نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جعفر کے ابا واپس جانے لگے، وہ جعفر کو اپنے ساتھ گیٹ کی طرف لے گئے۔ وہاں اپنی گاڑی کے پاس کھڑے ہو کر جعفر سے ہولے ہولے باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے جعفر کو بہت سی باتیں سمجھائیں۔ پھر گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔

جعفر طارق کے پاس آیا اور اسے ساتھ لے کر فریدہ کی کوٹھی کی طرف چلا گیا۔ راستے میں اس نے طارق سے کہا۔

''میں نے فریدہ کو سمجھا دیا ہے۔ وہ مان جائے گی لیکن وہ کہتی ہے کہ طارق میرے ساتھ دریا پر چلے۔''

''دریا پر؟'' طارق نے پوچھا۔ وہ دل میں بہت خوش ہوا۔ اسے دریا پر جانے کا بہت شوق تھا۔ جعفر نے جواب دیا۔ ''ہاں دریا پر..... ہم تینوں آج دریا پر جائیں گے۔ کشتی میں سیر کریں گے۔''

''میں اپنی ماں سے اجازت لوں گا۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو ضرور چلوں گا۔''

''وہ تو اجازت دے دیں گی۔ پہلے فریدہ کو لے جانے کے لیے اس کے ابا سے اجازت لینی ہے۔''

''تو فریدہ اجازت لے لے گی؟'' طارق نے پوچھا۔

''نہیں۔'' جعفر بولا۔ ''فریدہ نے کہا ہے کہ طارق میرے ابا جان سے میرے جانے کی اجازت لے گا تو میں جاؤں گی۔''

''لیکن.....'' طارق کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ جعفر جلدی سے بولا۔

''لیکن کیا..... یار! تم اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتے۔''

''اگر انہوں نے انکار کر دیا تو.....'' جعفر جلدی سے بولا۔

''فریدہ کے ابا تمہاری ہر بات مان جاتے ہیں۔ چلو ان سے پوچھ لو۔''

''تم بھی آؤ میرے ساتھ۔'' طارق نے کہا۔

''چلو۔'' جعفر طارق کے ساتھ چلنے لگا۔

فریدہ کے ابا اس وقت باہر دالان میں بیٹھے دھوپ تاپ رہے تھے۔ ان کے سامنے اخبار رکھا تھا اور ایک طرف حقہ پڑا تھا۔ جعفر طارق کے ساتھ لان تک گیا، پھر وہ رک گیا اور بولا۔

''وہ بیٹھے ہیں تایا جان۔ ان کے پاس جا کر کہنا، ہم دریا پر جانا چاہتے ہیں۔ آپ فریدہ کو ہمارے ساتھ بھیج دیجیے۔ ہم دو گھنٹے تک واپس آ جائیں گے۔'' طارق فریدہ کے ابا کے پاس گیا۔ ان سے دریا

پر جانے کی اجازت چاہی۔ فریدہ کے ابانے کہا۔

"بیٹے تم نے آج پہلی بار مجھ سے فریدہ کو ساتھ لے جانے کی اجازت مانگی ہے۔ میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ تم اسے ساتھ لے جاؤ لیکن میری بات یاد رکھنا، دریا پر زیادہ دیر نہ رکنا اور نہ ہی اس میں نہانے کی کوشش کرنا۔ دریا پر کئی حادثے ہو چکے ہیں۔"

"جی بہت اچھا۔" طارق نے کہا۔

"فریدہ کو بلاؤ۔" فریدہ کے ابا جان نے کہا۔ طارق بھاگ کر جعفر کے پاس گیا۔ جعفر پہلے ہی تیار کھڑا تھا۔ اس نے فریدہ کو آواز دی۔

فریدہ اپنے ابا جان کے پاس آئی۔ جعفر اور طارق بھی وہاں کھڑے ہوگئے۔ فریدہ کے ابا جان نے تینوں کو نصیحت کی اور یہ بھی کہا کہ دریا پر کوئی شرارت نہ کی جائے۔ تینوں نے وعدہ کیا کہ وہ ہر بات پر عمل کریں گے۔ اب فریدہ کے ابا نے اپنے ڈرائیور کو بلوایا اور اس سے کہا۔ "بھئی بچوں کو دریا پر چھوڑ آؤ اور ایک گھنٹے کے بعد جا کر انہیں واپس لے آنا۔"

"بہت اچھا حضور۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"میں اپنی امی سے پوچھ آؤں۔" طارق نے کہا اور خوشی خوشی اپنی ماں کے پاس گیا۔ طارق کی ماں اس وقت فریدہ کی امی کے پاس بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔ طارق نے ان سے اجازت مانگی تو فریدہ کی امی بولیں۔ "ہاں بہن! طارق کو جانے دو نا! فریدہ بھی جا رہی ہے۔"

"کیوں نہیں۔" طارق کی ماں بولیں۔ "جب فریدہ جا رہی ہے تو طارق کیوں نہیں جائے گا۔" طارق خوشی سے اچھلتا ہوا جعفر کے پاس آگیا اور وہ تینوں گاڑی میں بیٹھ کر دریا کی طرف روانہ ہوئے۔

جعفر، طارق اور فریدہ تینوں فریدہ کی گاڑی میں بیٹھ کر دریا کی طرف جا رہے تھے۔ طارق اس وقت بہت خوش تھا کیوں کہ وہ پہلے صرف ایک بار فریدہ کے ساتھ دریا پر گیا تھا۔ اب اسے وہاں سیر کرنے کا دوسرا موقع ملا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی فریدہ کی طرف دیکھا۔ فریدہ کار سے باہر دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے جعفر کی طرف دیکھا۔ جعفر، طارق کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔

"آج دریا پر خوب سیر کریں گے۔"

"ہاں۔" طارق نے کہا اور پھر فریدہ کی طرف دیکھا فریدہ ابھی تک باہر دیکھ رہی تھی۔ طارق اداس ہوگیا۔ اس نے سوچا۔ "میرا خیال تھا فریدہ کل سے روٹھی ہوئی ہے۔ میں اس کے ساتھ دریا پر جاؤں گا تو مان جائے گی۔ جعفر نے بھی یہی کہا تھا۔ میں جعفر سے کہتا ہوں کہ تم نے ہماری صلح کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب کراؤ نا صلح۔" پھر طارق نے اپنے آپ سے کہا۔ "فریدہ مجھ سے ذرا سی بات پر روٹھی ہے۔ پہلے تو مجھ سے کبھی نہیں روٹھتی تھی۔ ایک دفعہ جعفر نے اسے اپنے گھر چلنے کے لیے کہا تھا تو وہ میرے بغیر وہاں نہیں گئی تھی۔ اب اسے کیا ہوگیا ہے۔" اس کا جی چاہا کہ فریدہ سے خود ہی بات کرے۔ یہ سوچ کر طارق نے تیسری بار فریدہ کی طرف دیکھا۔ فریدہ اب جعفر سے کہہ رہی تھی۔

"آج تو بادل بھی آ رہے ہیں۔ بارش ہوگئی تو خوب مزا آئے گا۔"

"بارش ہوگئی تو ٹھنڈ بھی ہو جائے گی جناب!" جعفر نے کہا۔ پھر اس نے طارق کی طرف مڑ کر کہا۔ "کیوں طارق بھائی!"

"ہوں...... کیا کہا؟" طارق چونک کر بولا۔ جعفر نے طارق کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔

"ارے میاں! کہاں ہو؟ کیا آج بھی اسکول میں پہنچے ہوئے ہو۔" جعفر کی یہ بات سن کر فریدہ نے قہقہہ لگایا۔ طارق چپ رہا۔ جعفر نے کہا۔ "یا پھر اپنی امی کے ساتھ فریدہ کے برتن مانجھ رہے ہو۔" جعفر کی اس بات پر فریدہ کو پھر ہنسی آگئی۔ طارق کو غصہ آگیا، اس نے غصے سے جعفر کو دیکھا، پھر فریدہ کی طرف۔ فریدہ کو ہنستا دیکھ کر طارق کا غصہ بڑھ گیا لیکن جلد ہی اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

طارق سوچنے لگا۔ "جعفر نے بے عزتی کی ہے۔ شاید اس نے جان بوجھ کر ایسی بات نہیں کی کیوں کہ اب وہ میرا دوست بن چکا ہے۔ پھر بھی اسے یہ بات کہنے کا کوئی حق نہیں۔ اور فریدہ کو دیکھو وہ اس بات پر ہنس رہی ہے۔ پہلے وہ خود ایسی باتوں سے جعفر کو منع کیا کرتی تھی۔ اب ہنس رہی ہے۔" طارق نے اپنے آپ سے کہا۔

"فریدہ آخر امیر باپ کی بیٹی ہے نا...... اور ہم ان کے گھر کام کرتے ہیں۔ ہم غریب اور مجبور ہیں۔" یہ سوچ کر طارق کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کا دل چاہا کہ کار کہیں رک جائے اور وہ کار سے اتر کر واپس اپنے گھر چلا جائے۔ جعفر نے طارق کی طرف دیکھا اور بولا۔

"ادھر کہاں دیکھ رہے ہو؟ ہم سے کچھ بات تو کرو۔" طارق نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے فریدہ اور جعفر کی نظریں بچا کر اپنے آنسو پونچھ دیے۔

"کیا بات کروں؟" طارق نے کہا۔ فریدہ، طارق کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ طارق کو جعفر کی بات سے رنج پہنچا ہے۔ اس نے فوراً اپنی ہنسی روک لی اور طارق کی طرف دیکھنے لگی۔ اس خیال

ہے کہ طارق اس سے کوئی بات کرے گا۔ وہ پھر طارق سے بات چیت شروع کردے گی لیکن طارق نے کوئی بات نہ کی۔

"میاں! تم سیر کرنے جارہے ہو......" جعفر نے ابھی بات پوری نہیں کی تھی کہ فریدہ بولی۔

"چپ کرو جعفر! وہ ہم سے بات ہی نہیں کرتا تو ہم کیوں بولیں۔"

"کیوں چپ کروں!" جعفر بولا۔ "ہم سیر کرنے جارہے ہیں، ماتم کرنے نہیں جارہے۔"

طارق نے فریدہ کو اپنی طرف دیکھتے پایا تو وہ فوراً نظریں پھیر کر باہر دیکھنے لگا۔ فریدہ سمجھ گئی طارق بہت ناراض ہے۔ فریدہ طارق کی خاموشی سے تنگ آگئی اور ایک دم بولی۔ "ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تمہیں اس سے کیا۔" طارق نے جواب دیا۔

"تم ہمارے ساتھ آئے ہو۔" جعفر بولا۔ "پھر ہم سے بات کیوں نہیں کرتے۔"

"میری مرضی۔" طارق نے جواب دیا۔

"ہر بات میں اپنی مرضی کرتے ہو۔" فریدہ بولی۔

"تم اپنا کام کرو۔" طارق بولا۔

"اپنا کام کرو۔" فریدہ منہ چڑا کر بولی۔

"اگر اتنی ہی ناراض ہو تو مجھے ساتھ کیوں لائی ہو۔" طارق نے غصے سے کہا۔

"میں ساتھ لائی ہوں؟" "فریدہ زور سے بولی۔ ابا جان سے اجازت کس نے لی ہے مجھے لانے کے لیے؟"

طارق خاموش رہا۔ فریدہ جعفر سے کہنے لگی۔

"بتاؤ جعفر! ابا جان سے کس نے اجازت لی ہے؟"

"طارق نے۔" جعفر نے جواب دیا۔

"اب بتاؤ" فریدہ نے طارق کا بازو ہلا کر کہا۔ طارق نے اپنا بازو کھینچ لیا۔

"بولتے کیوں نہیں؟" فریدہ نے پھر زور سے کہا۔ طارق چپ رہا۔

"تم جھوٹے ہو نا اسی لیے نہیں بولتے۔"

طارق کو اور بھی غصہ آگیا۔ وہ بولا۔ "میں جھوٹا ہوں، میں جھوٹا ہوں......" یہ کہہ کر طارق نے ڈرائیور سے کہا۔

"بھائی جان! گاڑی روکیں۔ میں اتروں گا۔ میں واپس جاؤں گا۔"

"بیٹے! لڑائی نہیں کرنی چاہیے۔" ڈرائیور نے مڑ کر طارق اور فریدہ سے کہا۔ گاڑی رک گئی۔ وہ دریا کے کنارے پر تھے۔ ڈرائیور گاڑی لے کر واپس چلا گیا۔ دریا میں کنارے کے ساتھ ساتھ کئی کشتیاں کھڑی تھیں۔ ایک ملاح اٹھ کر ان کی طرف آیا اور بولا۔

"آؤ بابو صاحب! آپ کو دریا کی سیر کرالاؤں!"

جعفر نے جواب دیا۔ "ہاں! ہاں! ضرور۔" یہ کہہ کر جعفر، فریدہ اور طارق کو ساتھ لے کر کشتی میں بیٹھ گیا۔

وہ کشتی میں سیر کرتے ہوئے دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں تینوں کشتی سے اترے۔ ملاح نے کشتی ایک رسے کے ساتھ باندھ دی اور خود کشتی میں بیٹھ کر مزے سے سگریٹ پینے لگا۔

"بابو صاحب! زیادہ دُور نہ جانا۔" ملاح نے زور سے کہا۔ ملاح کی آواز سن کر طارق چونکا۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے یہ آواز پہلے بھی سنی ہے۔ طارق نے سوچا۔ "جب ہم موٹر سے اترے تھے تو اس وقت بھی ملاح کی باتیں سن کر مجھے یہی شک گزرا تھا۔ یہ آواز کہاں سنی ہے؟" اس نے کشتی میں بیٹھے ہوئے ملاح کو بڑے غور سے دیکھا اور اس کے دل نے فوراً کہا۔

"یہ تو وہی لمبا کالا آدمی ہے جو مجھے اٹھا کر پہاڑی پر لے گیا تھا اور مجھے مار ڈالنا چاہتا تھا۔" طارق خوف سے کانپ گیا۔ اس کی ٹانگیں تک لرزنے لگیں۔ جعفر نے طارق کی طرف دیکھا اور بولا۔

"طارق! یہ دیکھو کیا چیز ہے پانی میں۔" طارق دریا میں دیکھنے کے لیے آگے جھکا تو جعفر نے اسے دھکا دے دیا۔ طارق پانی میں گرنے ہی لگا تھا کہ اس کا ہاتھ فریدہ کے بازو پر پڑا۔ فریدہ نے چیخ ماری اور اچانک فریدہ دریا میں گر کر غوطے کھانے لگی۔

جعفر نے دوبارہ طارق کو دریا کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی لیکن اب طارق ہوشیار ہوگیا تھا۔ وہ جان گیا کہ جعفر اسے دھکا دے کر دریا میں گرانا چاہتا ہے۔ وہ فوراً کنارے سے دُور ہٹ گیا۔ فریدہ پانی میں گرتے ہی چلانے لگی۔ جعفر نے طارق کو چھوڑ دیا اور شور مچانے لگا۔

"بچاؤ، بچاؤ...... مجھے طارق سے بچاؤ۔ یہ مجھے بھی دریا میں گرانا چاہتا ہے۔" کچھ لوگ دُور کھڑے تھے، وہ بھاگے بھاگے آئے۔ دو تین کشتیاں بھی اس طرف آگئیں۔ ان کشتیوں میں کئی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے کالے آدمی نے اپنے سگریٹ کو پھینک دیا اور جھٹ دریا میں کود پڑا۔ دوسری کشتیوں سے بھی دو لڑکے پانی میں کودے اور ڈوبتی ہوئی فریدہ کی طرف تیرتے ہوئے آئے۔ ان کے آنے سے پہلے لمبا کالا آدمی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے فریدہ کو پانی سے نکالا اور کنارے پر لے آیا۔

بہت سے لوگ جعفر اور طارق کے گرد جمع ہوگئے۔ جعفر اب بھی شور مچا رہا تھا۔ "مجھے بچاؤ...... مجھے بچاؤ" طارق کی حالت عجیب ہو

رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

ایک تو اسے جعفر نے دریا میں گرانے کی کوشش کی تھی۔ دوسرے فریدہ اچانک پانی میں گر گئی۔ اس بات کا طارق کو بہت دکھ تھا اور اب جعفر شور مچا رہا تھا اور الٹا طارق پر الزام لگا رہا تھا۔

ایک نوجوان لڑکے نے طارق کو آ کر پکڑ لیا اور بولا۔

"تجھے! اس لڑکے سے کیا دشمنی ہے جو اسے دریا میں گرانا چاہتا ہے۔"

ایک لڑکی نے پوچھا۔ "اس لڑکی کو کس نے دریا میں دھکا دیا تھا؟"

"اسی نے دھکا دیا ہے......" جعفر نے فوراً طارق کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تو نے کیوں دھکا دیا ہے؟" نوجوان لڑکے نے پوچھا۔

"کیوں دھکا دیا ہے؟" لڑکی بولی۔

"کیوں دھکا دیا ہے...... کیوں دھکا دیا ہے؟" کئی آوازیں آئیں۔

طارق پریشان اور بدحواس تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ ایک آدمی نے آگے آ کر طارق کا بازو پکڑ لیا اور بولا۔

"چلو اسے تھانے لے چلو" ایک اور بولا۔ "یہ لڑکا ہے کون؟"

"اس کی ماں میرے تایا جان کی کوٹھی میں کام کرتی ہے۔" جعفر نے کہا۔

"وہ فریدہ ہے۔ میرے تایا کی بیٹی۔ پہلے اس نے فریدہ کو دھکا دیا۔ پھر مجھے گرانے لگا۔ اچھا ہوا آپ لوگ آ گئے ہیں اور میں بچ گیا۔"

طارق پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کچھ لوگوں نے کہا۔

"چھوڑو اسے، ہم کیوں اپنی تفریح خراب کریں۔"

لوگوں نے طارق کو چھوڑ دیا۔ جعفر اور فریدہ کو لمبے آدمی نے کشتی میں بٹھا لیا اور کشتی لے کر چلا گیا۔ بے چارا طارق اس کنارے پر روتا رہ گیا۔ کالا آدمی اور جعفر فریدہ کو ایک ٹیکسی میں بٹھا کر گھر لائے کیوں کہ فریدہ کا ڈرائیور ابھی وہاں نہیں پہنچا تھا۔ فریدہ کے ابا گھر میں موجود تھے۔ انہوں نے جب فریدہ کی یہ حالت دیکھی تو پریشان ہو کر بولے۔

"کیا ہوا...... یہ کیا ہوا؟" اتنے میں دوسرے کمرے سے فریدہ کی امی بھی آ گئیں۔ وہ اپنی بیٹی کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئیں اور رو کر بولیں۔

"میری بچی کے دشمنوں کو کیا ہوا؟"

جعفر کچھ جواب دینے ہی لگا تھا کہ فریدہ کے ابا نے پوچھا۔

"طارق کہاں ہے؟"

"وہ نہیں آیا۔" جعفر نے جواب دیا۔ "چچا جان! طارق نے فریدہ کو دریا میں گرا دیا تھا۔"

"طارق نے؟" فریدہ کی امی چونک کر بولیں۔

"جی ہاں!" جعفر نے جواب دیا۔ "وہ فریدہ سے لڑتا تھا۔ راستے میں جھگڑا کیا۔ دریا پر بھی لڑائی کی۔ پھر اس نے......" جعفر نے اتنا ہی کہا تھا کہ فریدہ کے ابا بولے۔ "طارق کبھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔"

جعفر نے جواب دیا۔ "آپ کشتی چلانے والے سے پوچھ لیں تایا جان! فریدہ سے بھی پوچھ لیں۔" فریدہ کے ابا باہر گئے۔ وہاں برآمدے میں لمبا کالا آدمی کھڑا تھا۔ اس نے جعفر کی بات کی تائید کی۔

پھر ابا واپس اندر آئے اور فریدہ سے پوچھنے لگے لیکن فریدہ بُری طرح رو رہی تھی۔ دریا میں گرنے کی وجہ سے اسے بڑا صدمہ پہنچا تھا اور کچھ بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ فریدہ کے ابا نے اپنے ڈرائیور کو بلوایا۔ ڈرائیور نے بتایا۔ "جب میں بچوں کو دریا پر لے جا رہا تھا تو فریدہ اور طارق میں جھگڑا ہوا تھا لیکن دریا پر کیا ہوا، یہ معلوم نہیں۔"

فریدہ کے بوڑھے نوکر کو پتا چلا تو وہ بھاگا بھاگا باورچی خانے میں گیا۔ وہاں طارق کی ماں برتن صاف کر رہی تھیں۔ نوکر نے اسے ساری بات بتائی۔ وہ پریشان ہو کر اٹھیں اور کمرے میں آتے ہی بولیں۔

"نہیں، نہیں...... میرا طارق ایسا نہیں۔ وہ کبھی فریدہ کو دھکا نہیں دے سکتا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ طارق کی ماں کو کمرے میں دیکھ کر فریدہ کے ابا اور امی چپ ہو گئے۔ طارق کی ماں سیدھی فریدہ کی طرف آئیں اور اس کے دونوں بازو ہلا کر بولیں۔

"بتاؤ بیٹی! بتاؤ؟ کیا تمہیں طارق ہی نے دریا میں گرایا تھا۔"

"مجھے معلوم نہیں۔" فریدہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"طارق ہی نے گرایا تھا۔" جعفر جلدی سے بولا۔ "سب لوگوں نے دیکھا ہے۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" طارق کی ماں نے غصے سے کہا۔

"اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔" فریدہ کے ابا بولے۔

"یہ طارق کا دشمن ہے۔ یہ ہمارا دشمن ہے۔" طارق کی ماں اور بھی غصے سے بولیں۔ "اسی نے فریدہ کو گرایا ہوگا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" فریدہ کی امی بولیں۔

"اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے میرے بھتیجے پر الزام لگا رہی ہیں۔" فریدہ کے ابا غصے سے بولے۔

"ہاں میں الزام لگا رہی ہوں...... میں الزام لگاؤں گی، میں الزام لگاؤں گی۔" طارق کی ماں یہ کہتی ہوئی کمرے سے نکلیں اور پاگلوں کی طرح کوٹھی سے باہر نکل گئیں۔

آپ بھی لکھیے

قناعت

(محمد تیمور ذوالفقار، لاہور کینٹ)

عمر اپنا مرجھایا ہوا چہرہ لے کر گھر کو لوٹ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بہت گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ راستے میں اسے رحمت بابا ملے۔ انہوں نے عمر کے چہرے پر پریشانی دیکھی تو عمر سے پریشانی کی وجہ دریافت کی اور کہا کہ بیٹا آج کل تم مسجد میں نماز پڑھنے بھی نہیں آتے۔ پہلے تو تم کوئی بھی نماز نہیں چھوڑتے تھے۔ آخر تمہیں دو تین دن سے کیا ہوگیا ہے؟ وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہتے چلے گئے۔ عمر نے کہا۔ ''بابا جان! میں اللہ سے بہت مایوس ہوں۔'' رحمت بابا کو عمر کے اس جواب نے ایک گہری سوچ میں گم کر دیا۔

عمر نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ عمر کے والد نے تنگ دستی کے باوجود اسے اکیڈمی میں داخل کروایا تھا۔ اکیڈمی میں ہر طرح کے بچے آتے تھے لیکن عمر کی دل چسپی اپنے سے امیر بچوں میں زیادہ تھی۔ وہ ان کے قیمتی لباس اور قیمتی چیزوں سے بہت متاثر ہوتا تھا۔

رحمت بابا نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے عمر سے پریشانی کی وجہ پوچھی۔

عمر نے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ میری کوئی بھی دعا کو قبول نہیں کرتے۔''

رحمت بابا نے عمر سے کہا۔ ''کون سی دعا قبول نہیں ہوئی؟''

''اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں غریب لوگ کیوں پیدا کیے ہیں، سب کو ایک جیسا کیوں نہیں بنایا۔'' عمر کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ رحمت بابا نے عمر کے آنسو صاف کیے اور کہا۔ ''عمر بیٹا! اللہ نے جو کچھ دیا ہے، اس کا شکر کرو اور جو کچھ نہیں ہے اس پر قناعت اختیار کرو اور صبر کرو۔'' عمر نے کہا۔ ''میرے سب دوست امیر ہیں۔ سب کے پاس موٹر سائیکل ہے اور میرے پاس صرف ایک پرانی سی سائیکل ہے۔ میرے تمام دوست میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔''

رحمت بابا نے کہا۔ ''بیٹا! حضرت علیؓ کا قول ہے کہ اگر دُنیا آرام وسکون سے رہنے کی جگہ ہوتی تو کوئی انسان روتے ہوئے پیدا نہ ہوتا۔ اسی طرح اپنے نفس کو جتنا بھی بڑھاؤ گے، اس کی خواہشات بڑھتی چلی جائیں گی۔ بہتر زندگی تو وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضا کے مطابق گزاری جائے۔ اس دُنیا کا کیا ہے، اس کی ہر چیز فانی ہے۔ ہر چیز ایک نہ ایک دن ختم ہو جائے گی۔ دُنیا کا مال و دولت دُنیا میں ہی رہ جائے گا۔ آخرت کے روز انسان کے کیے ہوئے نیک اعمال اس کے کام آئیں گے۔ عمر بیٹا! دُنیا داری میں ہمیشہ اپنے سے نچلے کو دیکھو اور دین داری میں اپنے سے اونچے کو دیکھو۔ ایسے بہت سے بچوں کی مثالیں تمہارے سامنے ہیں، جو کام بھی کرتے ہیں اور پڑھائی بھی کرتے ہیں اور کچھ بچے تو علم کے زیور سے محروم ہیں۔'' یہ کہہ کر رحمت بابا نے اپنی چائے ختم کر کے عمر کے سر پر ہاتھ پھیرا اور عصر کی نماز کی تیاری کرنے لگے۔ جب وہ مسجد میں پہنچتے ہیں تو ان کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ وہ عمر کو اپنے سے پہلے مسجد میں موجود پاتے ہیں۔

(پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

سچی توبہ

(طلحہ جدون، مردان)

سیٹھ اکبر ایک نواب تھا۔ اس کے بہت سے نوکر چاکر، گاڑیاں، وسیع زمینیں اور ایک بہت بڑی حویلی تھی جس میں وہ اپنی بیوی اور ایک بچے لقمان کے ساتھ رہ رہا تھا۔ بے جا لاڈ پیار نے بچے کو خراب کر دیا تھا۔ ہر کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا، گالی گلوچ اس کا معمول تھا۔ اس کے ماں باپ نیک تھے جب کہ لقمان اس کے برعکس تھا۔ اس کو جب بھی وہ نصیحت کرتے تو اس کے کانوں پر جوں تک بھی نہ رینگتی۔

لقمان بُرے دوستوں کی صحبت میں رہ کر بگڑ گیا۔ دن اسی طرح کٹ رہے تھے کہ لقمان جوان ہوگیا اور اس کے والدین

بوڑھے ہوگئے۔ ایک دن تو اس نے حد کردی کہ اپنے والدین کو اولڈ ہاؤس بھیج دیا۔ اب وہ ساری جائیداد کا مختار کل ہوگیا۔ نوکروں پر ظلم کرتا، غریب کسانوں سے بہت زیادہ لگان لیتا تھا۔ اس نے گاؤں میں کوئی نیا اسکول نہ بننے دیا۔ لوگ اسے بددعائیں دینے کے علاوہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔

آخر کب تک! ایک دن خوب آندھی آئی اور زوروں کی بارش برسی۔ نہر میں سیلاب آگیا اور اس کی ساری فصل تباہ و برباد ہو گئی۔ وہ پریشانی کے عالم میں اپنی زمینوں کی طرف گیا۔ پیچھے سے چوروں نے اس کی حویلی کا صفایا کردیا۔

وہ پریشانی کے عالم میں اپنی حویلی میں بیٹھا تھا۔ کھانا سامنے رکھا تھا کہ باہر سے کسی مسافر کی صدا آئی جو کھانا مانگ رہا تھا۔ اس نے اپنا کھانا اسے دے دیا۔ آج پہلی بار دوسروں کی مدد کر کے اسے دلی خوشی ہو رہی تھی۔ پھر اس کو اپنی والدہ کی نصیحت یاد آ گئی کہ بیٹا ہر مشکل وقت میں پریشان ہونے کی بجائے رب کائنات کو یاد کیا کرو۔ اس وقت قریب کی مسجد سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھا، وضو کیا اور نماز پڑھنے مسجد کی طرف چل پڑا۔ عید کی نماز کے بعد آج اس نے پہلی بار نماز پڑھی لیکن آج اسے نماز میں بڑا سکون مل رہا تھا۔ اس نے خوب گڑگڑا کر اللہ سے معافی مانگی۔

سیٹھ لقمان نے اپنی ضرورت سے زائد رقم غریبوں میں تقسیم کردی اور اپنے والدین کو حویلی میں واپس لے آیا۔

اس نے اپنی زندگی والدین اور لوگوں کی خدمت کے لیے وقف کردی۔ اب اس کے دروازے پر کوئی غریب آدمی نہ آتا تھا کیوں کہ وہ غریبوں کے گھر خود جا کر ان کی ضروریات پوری کرتا تھا۔ اب لوگ سیٹھ لقمان کو حاجی صاحب کہہ کر پکارنے لگے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی سچی توبہ اور خدمتِ خلق اتنی پسند آئی کہ اس کی نسل میں خوب اضافہ ہوا اور اس کی نسل اس کے نام سے "حاجی خیل" مشہور ہوگئی۔ یوں اس کا نام رہتی دُنیا تک اچھے لفظوں میں یاد کیا جانے لگا۔

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

(سوزین خان، جہلم)

ایک گاؤں میں ارفع نام کی ایک بڑھیا رہتی تھی۔ بڑھیا کی ایک بیٹی ماہ جبیں تھی جسے سب مالا کہتے تھے۔ سب گاؤں والے مالا سے بہت پیار کرتے تھے۔ مالا گاؤں والوں کے تمام کام خوشی خوشی کر دیتی۔ مالا نہایت دلیر لڑکی تھی۔ گاؤں والے اسے بہت پسند کرتے تھے مگر حکیم کی بیٹی رانو اس سے سخت نفرت کرتی تھی۔ وہ اس کی تعریفیں سن سن کر جلتی تھی۔ مالا کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ یوں تو یہ گاؤں بھی بہت خوب صورت تھا مگر مالا روپ نگر دیکھنا چاہتی تھی۔ رانو کی نانی کا گھر روپ نگر میں تھا اور وہ وہاں کی سب جگہوں سے واقف تھی۔ اس نے رانو سے بات کی اور رانو اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ ادھر رانو، مالا کے خلاف چال چلنے لگی کہ وہ مالا کو ساتھ لے جائے گی اور گھنے جنگل میں چھوڑ کر واپس آ جائے گی اور اسے کوئی درندہ کھا جائے گا۔ اگلے دن وہ دونوں روپ نگر روانہ ہوگئیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ جھیل کے راستے جائیں گی۔ چنانچہ انہوں نے جھیل کو پار کرنے کے لیے کشتی لی۔ مالا نے کیمرہ بھی ساتھ لیا ہوا تھا۔ راستے میں وہ جھیل کے دل کش مناظر کو محفوظ کرتی اور اُڑتے پرندوں کی تصویریں بھی کھینچتی رہی۔ کشتی نے ان دونوں کو کنارے پر اتارا۔ ان دونوں نے واٹر پروف جیکٹ اتاری اور آگے چل دی۔ اب جنگل شروع ہو چکا تھا۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی بڑا دل کش نظارہ تھا۔ ہر طرف پرندوں کا شور تھا۔ مالا نے بہت سے نظاروں کو کیمرے میں محفوظ کر لیا۔ آبشاریں زور و شور سے بہہ رہی تھیں۔ تھوڑا سا آگے جاتے ہی رانو اور مالا کو بھوک لگ گئی۔ مالا گھر سے کھانا لائی تھی، پھر دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ اتنے میں رانو کو یاد آیا کہ وہ اپنا پرس کشتی میں بھول آئی ہے۔ اس نے مالا سے کہا کہ وہ ابھی جنگل میں گھومے، اتنے میں وہ پرس لے آتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی۔ مالا کو گھومتے گھومتے پتا ہی نہیں چلا کہ رانو آئی ہی نہیں۔ جب دن گزر گیا اور شام ہونے لگی تو مالا کو گھر جانے کی فکر ہوئی۔ مالا پریشان ہوگئی اور پیچھے مڑنے لگی مگر رات ہوگئی تھی۔ مالا کو تو راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ بہت بہادر تھی اور ایک درخت کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو سامنے اس کی ماں کھڑی تھی۔ مالا ماں سے پوچھنے لگی کہ ماجرہ کیا ہے؟ وہ یہاں کیسے آئی اور رانو کہاں ہے؟ ماں نے مالا کو بتایا کہ رانو تم کو گاؤں سے نکالنا چاہتی تھی، اس نے واپس جا کر بتایا کہ

تمہیں جنگلی درندہ کھا گیا ہے اور وہ جان بچا کر آئی ہے۔ میں نے سنا تو مجھے یقین نہ آیا، میں تمہیں ڈھونڈنے یہاں آ گئی اور تم مجھے مل گئی۔ مالا کو یہ سن کر بہت دکھ ہوا۔ پھر وہ دونوں گاؤں کی طرف چل دی۔ گاؤں پہنچ کر پتا چلا کہ شدید سیلاب اور طوفانی بارش کی وجہ سے پورا گاؤں تباہ ہو گیا ہے۔ رانو اور اس کے گھر بھی محفوظ نہ رہ سکے۔

دیکھا بچو! جو دوسروں کے لیے بُرا سوچتا ہے، اس کے ساتھ خود بُرا ہو جاتا ہے کیوں کہ انسان بعض اوقات نفرت میں آ کر یہ بھول جاتا ہے کہ اس کا خدا اسے دیکھ رہا ہے۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

سبق

(محمد زوہیب سواس، ضلع کوہاٹ)

عصمت گل اپنی کلاس کا ذہین ترین لڑکا تھا۔ وہ ہر کام وقت پر کرتا تھا۔ اُستاد جیسے پڑھاتے، ویسے ہی وہ اسے یاد کر لیتا۔ اب وہ دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ تمام اُستاد اس کی تعریفیں کرتے اور ہم جماعت بھی بہت احترام سے پیش آتے تھے۔ والدین نے اس کی ذہانت کی وجہ سے اس سے لاپرواہ ہو گئے۔ اب اس میں غرور پیدا ہو گیا۔ وہ تمام اُستادوں کو بہانہ کر کے ٹال دیتا۔ اس میں اتنا غرور پیدا ہو گیا کہ جب اساتذہ کرام سبق پڑھاتے تو وہ توجہ نہ دیتا۔ موسم گرما کی تعطیلات ہوئیں تو عصمت نے تعطیلات کا کام بھی نہ کیا۔ اب وہ اپنے اساتذہ کو بہانہ کرتا کہ بیمار ہو گیا تھا جس کی وجہ سے کام مکمل نہیں ہو سکا اور جو اُستاد زیادہ سختی کرتا، اس کو اپنی نیٹ کاپیوں سے تاریخ مٹا کر چیک کرا دیتا۔ لڑکوں سے ہمیشہ کہتا کہ بے وقوفو! تم تو چھٹیوں میں تفریح بھی نہ کر سکے اور اپنے غلط کارناموں سے ہم جماعتوں کو فخر سے بتاتا۔ ایک دن اس کی باتوں کو باہر کھڑے ایک اُستاد سر مطیع اللہ نے سن لیا۔ یہ اسکول میں اپنی سخت گیر طبیعت کی وجہ سے جانے جاتے تھے۔ انہوں نے جیسے ہی سنا، فوراً پرنسپل صاحب کو عصمت کی شکایت لگائی۔

پرنسپل صاحب نے اس کے بیگ کی تلاشی لی تو اس میں سے تین سگریٹ، چاقو، موبائل اور نیٹ کاپیاں نکلیں اور ان پر اساتذہ کے چھٹیوں والے دستخط تھے۔ پرنسپل صاحب نے فوراً اس کے باپ کو بلا کر اس کی حرکتوں سے آگاہ کیا تو اس کے والد نے اسے پرنسپل کے آفس میں ہی تین تھپڑ رسید کیے اور جب پرنسپل صاحب نے اسے اسکول سے خارج کر دیا تو اب عصمت گل کو دسویں کے پرچے پرائیویٹ دینے پڑے جس میں وہ بمشکل C گریڈ پاس ہوا۔

اب وہ ہر کسی سے کہتا ہے کہ دوستو کبھی بھی اپنے اُستادوں کے ساتھ اُستادی مت کرنا کیوں کہ اس نے اپنی غلطیوں سے سبق سیکھ لیا تھا۔

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

ایک کہانی تین سبق

(نقیب الفضل، راول پنڈی)

آج حیدر بہت خوش تھا کیوں کہ اس کی دادی اماں بہت دنوں کے بعد گاؤں سے واپس ان کے گھر راول پنڈی آئی تھیں۔ حیدر کو رات سونے سے پہلے کہانی سننے کا بہت شوق تھا۔ اس نے دادی اماں سے کہانی سنانے کی فرمائش کر دی۔ اس کی دادی اماں نے اس کو پیار کیا اور کہا کہ بیٹا! آج تک تم نے جتنی بھی کہانیاں سنی ہیں، ان کا صرف ایک ہی سبق یا نتیجہ نکلتا ہے لیکن آج میں تمہیں ایک ایسی کہانی سناؤں گی جس کے تین سبق نکلتے ہیں۔

"بیٹا! ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سرما کا موسم تھا، برف باری ہو رہی تھی۔ ایک چڑیا دانے پانی کی تلاش میں گھونسلے سے اُڑی۔ تھوڑی دُور اُڑنے کے بعد اس کے اوپر برف کے چھوٹے چھوٹے گالے پڑے اور وہ چڑیا برف کے نیچے دب گئی۔ اسی اثناء میں وہاں سے ایک بھینس گزر رہی تھی اور اس نے اس جگہ پر گوبر کر دی۔"

"تو پھر آگے کیا ہوا؟" حیدر نے حیرانی سے دادی اماں کی طرف دیکھا۔ "دادو! چڑیا تو مر گئی ہو گی۔"

دادی اماں ہنس دیں اور کہا۔ "بیٹا صبر کرو۔ تھوڑی دیر میں گوبر کی حدت سے برف پگھل گئی اور وہ چڑیا گوبر میں سے اپنا سر نکال کے خوش ہو گئی اور گانا گانے لگی۔ اس کا گانا سن کر دُور جھاڑیوں میں سے ایک بلی نکل آئی۔ اس بلی نے چڑیا کو گوبر سے نکالا، گوبر صاف کیا اور کھا گئی۔"

"دادی اماں! یہ تو بہت بُرا ہوا۔" دادی اماں نے کہا کہ بیٹا اس

کہانی سے یہ سبق ملتا ہے کہ: اگر کوئی آپ پہ گندگی پھینکتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ واقعی وہ آپ کا دشمن ہو۔ مصیبت میں اگر تم پھنس جاؤ اور اس سے تمہیں چھٹکارا ملے تو خوش نہ ہو جاؤ۔ اگر کوئی تمہیں مصیبت یا تکلیف سے نکالتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ آپ کا فائدہ ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں مصیبت سے نکال کر وہ اپنا فائدہ حاصل کر جائے۔

جب دادی اماں نے اپنی کہانی ختم کی تو اس وقت حیدر سونے کی تیاری کر چکا تھا، دادی اماں نے اسے پیار کیا اور خود بھی سو گئی۔

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

ٹنکی، منکی اور جگنو ماموں

(محمد عزیر چشتی، ڈیرہ غازی خان)

ٹنکی اور منکی سفید رنگ کی نرم نرم بالوں والی پیاری بلیاں تھیں۔ وسط دسمبر کا مہینہ تھا، موسم سرما کی پہلی بارش شروع ہوا چاہتی تھی۔ امی جان کو اپنے گھر کی فکر ہوئی جو جامن کے پیڑ کی اونچی اور مضبوط شاخ میں تھا، جس کی حالت کافی خراب تھی۔ متوقع بارش کے پیش نظر انہوں نے گھر کے لیے ضروری اشیاء کی خریداری کے سلسلے میں شاپنگ کا پروگرام بنایا۔ انہوں نے ٹنکی اور منکی کو گھر میں رہنے کی ہدایت کی کیوں کہ باہر موسم خراب ہو رہا تھا اور ٹھنڈ بھی بہت زیادہ تھی۔ ٹنکی کافی سمجھ دار تھی جب کہ منکی نٹ کھٹ اور شرارتی تھی۔ امی کے جانے کے بعد منکی گھر میں ٹنکی سے بولی۔ ”دیکھو، باہر کتنا سہانا موسم ہو رہا ہے اور ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی ہے، باہر کا چکر لگا آئیں؟“ ٹنکی نے کہا کہ بارش شروع ہو چکی ہے، گھر میں ہی کوئی کھیل کھیلتے ہیں لیکن منکی نے اتفاق نہ کیا اور چھلانگ مار کر باہر دوڑ گئی۔

امی جان بارش میں بھیگی سامان سے لدی ہوئی گھر آ گئیں، ٹنکی سامان ترتیب دینے لگی۔ کچھ دیر بعد امی نے منکی کے بارے میں پوچھا تو ٹنکی کو یاد آیا کہ وہ تو باہر نکل گئی تھی۔ شام کا وقت تھا، بادلوں کی وجہ سے خوب اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اوپر سے تیز بارش تھی۔ منکی کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔ دونوں اسے ڈھونڈنے کے لیے زور زور سے آوازیں دینے لگیں۔ اتنے میں کچھ روشنی ہوئی۔ یہ جگنو ماموں تھے۔

انہوں نے خیریت دریافت کی اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں، میں روشنی کرتا ہوں۔ آپ میرے پیچھے پیچھے آئیں۔“ جگنو ماموں نے روشنی کی تو کیچڑ میں لت پت منکی پر نظر پڑ گئی۔

امی جان نے اسے اٹھایا، وہ تیز سردی میں ٹھٹھر رہی تھی۔ فوراً اسے گھر لے جا کر گرم کپڑے پہنائے۔ ٹنکی اس کے لیے گرم دودھ لے آئی، جس کو پی کر منکی کو سکون آیا۔ اتنے میں امی جان نے مٹر پلاؤ تیار کر لیا۔ جگنو ماموں کو پلاؤ کھا کر بہت مزہ آیا۔ پھر سب مل کر چائے سے لطف اندوز ہوئے جس نے سردی کی شدت کو کم کر دیا۔ جگنو ماموں کو ان کا گھر بہت پسند آیا۔ ہر چیز سلیقے سے سجی ہوئی تھی۔

اب بارش تھم چکی تھی۔ جگنو ماموں نے اجازت طلب کی، اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور کہا کہ اس شرارتی بلی منکی کو بھی ضرور لائیے گا۔ امی جان نے جگنو ماموں کا شکریہ ادا کیا، جن کی وجہ سے منکی کی جان بچ گئی۔ منکی نے کمبل سے سر نکال کر کہا۔ ”آئندہ میں ایسی شرارت نہیں کروں گی اور امی جان کا کہا مانوں گی۔“ جگنو ماموں چمکتے ہوئے باہر چلے گئے۔ ٹنکی اور منکی ان کو اندھیرے میں چمکتے ہوئے دور تک دیکھتی رہیں۔

تقویم

اسلامی مہینے	انگریزی مہینے	بکری مہینے
محرم	جنوری	پھاگن
صفر	فروری	چیت
ربیع الاول	مارچ	بیساکھ
ربیع الثانی	اپریل	جیٹھ
جمادی الاول	مئی	اساڑھ
جمادی الثانی	جون	ساون
رجب	جولائی	بھادوں
شعبان	اگست	اسوج
رمضان	ستمبر	کاتک
شوال	اکتوبر	مگھر
ذی قعدہ	نومبر	پوہ
ذی الحج	دسمبر	ماہ

ایڈیٹر کی ڈاک

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

تعلیم و تربیت کی جتنی بھی تعریف کروں، کم ہے۔ میں اسے بے حد پسند کرتی ہوں اور میری بہن شب نور کو بھی بہت پسند ہے۔ میں اس بار دو کہانیاں بھیج رہی ہوں، میری حوصلہ افزائی کیجیے گا۔

(میمونہ، ڈیرہ اسماعیل خان)

محترمہ ایڈیٹر صاحبہ! کیسی ہیں آپ؟ مئی کا شمارہ اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔ مئی کا شمارہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ خاص طور پر یتیم، شمع ازل اور انوکھی سزا ٹاپ پر تھیں۔ تمام سلسلے اور ناول بھی اچھے تھے۔ گزشتہ خطوط کی طرح میرے اس خط کو ردی کی ٹوکری کا مسکن نہ بنائیں۔ میرا خط اور لکھائی کیسی ہے؟

(ایمان زہرہ، لاہور)

☆ تعلیم و تربیت کی پسندیدگی کا شکریہ! آپ کا خط اور لکھائی بہت خوب صورت ہے۔

آج میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ تعلیم و تربیت بہت عمدہ ہے۔ ساری کہانیاں بہت ہی اچھی اور سبق آموز ہوتی ہیں۔ میں تقریباً دو سال سے یہ میگزین پڑھ رہی ہوں۔ تعلیم و تربیت واقعی تعلیم و تربیت کا کام سرانجام دے رہا ہے۔ میں نے اپنی ایک تحریر بھیجی ہے، براہ مہربانی اسے ضرور شائع کیجیے گا۔

(تحریم عثمان، گوجرانوالہ)

میں تعلیم و تربیت کا نیا قاری ہوں۔ مجھے آپ کا رسالہ بہت پسند آیا اور اس سے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے۔ میں نے پچھلا شمارہ پڑھا اور میں نے کچھ کہانیاں بھی بھیجی تھیں، وہ آپ نے شائع نہیں کیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس بار آپ ضرور میری کہانی شائع کریں گے۔

اس شمارے میں مجھے درس قرآن و حدیث، مختصر مختصر، محاورہ کہانی، ٹیپو سلطان بہت اچھی لگیں۔

(جواد الحسن، لاہور)

میں عبداللہ آٹھویں اور ضحیٰ چھٹی کلاس میں پڑھتے ہیں۔ ہم پہلی بار شرکت کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہمیں ضرور شامل کریں گے۔ ہم ہر ماہ یہ رسالہ پڑھتے تھے لیکن اب ہم اس میں حصہ لیا کریں گے۔ ہمارے پاپا پروفیسر ہیں۔ انہوں نے ہماری بہت حوصلہ افزائی کی، اس لیے ہم شرکت کر رہے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔ ہم انتظار کریں گے۔

(عبداللہ، ضحیٰ طاہر، گوجرانوالہ)

میں تعلیم و تربیت کا ایک نیا قاری ہوں۔ تعلیم و تربیت بہت پیارا رسالہ ہے۔ میرے ابو بچپن میں پڑھا کرتے تھے۔ ہمیں جو کچھ تعلیم و تربیت میں ملتا ہے، وہ کہیں نہیں ملتا ہے۔ آپ کی خدمت میں کھوج لگائیے، دماغ لڑاؤ اور میری زندگی کے مقاصد ارسال کر رہا ہوں اور یہ خط بھی ضرور شائع کریں۔ میری حوصلہ افزائی ہو گی۔ میں نے قرآن مجید حفظ کر لیا ہے اور یہ میرا پہلا خط ہے۔

(حافظ عبداللہ انعام، گجرات)

تعلیم و تربیت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ بہت عرصہ خط نہ لکھنے کی وجہ میرے میٹرک کے امتحانات تھے۔ مجھے امید ہے آپ میرے اچھے رزلٹ کے لیے ضرور دعا کریں گے۔ اب میں باقاعدگی سے خط لکھا کروں گی۔ مئی کے شمارے میں ٹیپو سلطان کا ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ اس میں میں نے ٹیپو سلطان کے بچپن سے لے کر جوانی تک کی زندگی کے بارے میں پڑھا۔ ان معلومات کا مجھے پہلے علم نہ تھا۔ مختصر مختصر، معلومات عامہ، بوجھو تو جانیں اور کھیل دس منٹ کا میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ کہانیاں بھی بہت خوب تھیں۔ میرا درست نام شائع کیا کیجیے۔

(حدیقہ عارف، لاہور)

تعلیم و تربیت کا مئی کا شمارہ بہت پسند آیا۔ مجھے تعلیم و تربیت پڑھتے ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ میں اب آٹھویں جماعت کی طالبہ ہوں۔ میرے اس ماہ پہلی سہ ماہی کے امتحان ہونے ہیں۔ دعا کیجیے گا۔ اللہ حافظ!

(افراح اکبر، لاہور)

☆ آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

میں آپ کا ماہنامہ تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتا ہوں اور اس میں شامل تحریریں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ جناب عالی! ہمارے ہاں

تعلیم و تربیت مارکیٹ میں تاخیر سے آتا ہے۔ برائے کرم کچھ ایسے اقدامات اٹھائیں جن کی وجہ سے ہمارے ہاں رسالہ وقت پر آجائے۔ میں نے اپنی بہت سی تحریریں آپ کو روانہ کیں لیکن ان میں سے کوئی بھی تحریر شائع نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ بھی بتا دیں۔ (عمر رضا، گجرات)

پہلے میری طرف سے معذرت کہ پچھلے دو ماہ سے شرکت نہ کر سکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ میرا بورڈ کا امتحان تھا اور آپ بھی میرے لیے دل سے دُعا کیجیے گا۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ چیف ایڈیٹر جناب عبدالسلام صاحب اب اس دُنیا میں نہیں رہے۔ میرے پورے گھر والے بھی اس پر آپ سے افسوس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت عطا فرمائے۔ آمین! میں آپ سے بہت ناراض ہوں کہ کیا آپ کی سرائے عالمگیر سے دشمنی ہے کہ وہاں مئی کا شمارہ جلد نہیں بھیجا۔ میں نے علاقہ کی سب دکانیں چھان ماری مگر نہ ملا۔ یہ میرا آپ سے شکوہ ہے۔ پھر 10 تاریخ گزر جاتی ہے اور میں حصہ نہیں لے سکتا۔ گزارش ہے کہ میرے لیے تو شمارہ بھیج دیا کریں۔ میرے ابو کی پانچ مئی کو سالگرہ تھی۔ تعلیم و تربیت کا معیار اور سب کے سب سلسلے اچھے ہیں۔ دلی دُعا ہے کہ یہ بہتر سے بہتر ہو۔ پچھلے کئی مہینوں سے خط شائع نہیں ہوا۔ کچھ تحریریں بھیج رہا ہوں، کیا ارادہ ہے ان کے بارے میں؟ آگاہ کیجیے گا۔ (اسامہ ظفر راجہ، سرائے عالمگیر)

☆ آپ کو اپنی باری کا انتظار کرنا پڑے گا۔

ماشاء اللہ! تعلیم و تربیت کے سلسلے بہت اچھے جا رہے ہیں۔ شمع ازل اوّل نمبر پر رہی۔ مجھے آپ سے یہ شکایت ہے کہ رسالہ بہت دیر سے ملتا ہے جو ہماری حوصلہ شکنی کا سبب ہے۔ آپ نے جو اُردو کے فروغ کے سلسلہ میں کہانیوں اور انعامی مالیت میں اضافہ کیا ہے، میں اس کو سراہتا ہوں۔ مجھے اسلامی مضامین اچھے لگتے ہیں، اس کے لیے کوئی مستقل سلسلہ شروع کیجیے۔ رانا محمد شاہد ہر مرتبہ ایک اچھا مضمون لے کر آتے ہیں۔ میں آپ کو ایک کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ مطلع ضرور کیجیے گا۔ (محمد شمیم عالم، اوکاڑہ)

☆ ڈیئر شمیم! آپ کی کہانی مل گئی ہے۔

تعلیم و تربیت ہمارے گھر میں بہت سالوں سے پڑھا جا رہا ہے مگر میں آج پہلی دفعہ آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میری نانی جان آج بہتر برس کی ہیں وہ بھی بچپن میں تعلیم و تربیت پڑھتی تھیں اور پھر میری امی جان بھی اس کو بہت شوق سے ابھی تک پڑھتی ہیں بلکہ ان کے پاس ابھی تک ان کے بچپن کے بھی کچھ شمارے موجود ہیں جن میں ان کی مختلف نگارشات شائع ہو چکی ہیں۔ امید کرتی ہوں کہ آپ میرے اس خط کو اپنے رسالے میں ضرور جگہ دیں گے۔ شکریہ! (رامین حبیب، لاہور)

میں تعلیم و تربیت کی نئی قاری ہوں۔ تعلیم و تربیت بہت اچھا رسالہ ہے۔ پہلے پہل تو میں خاموش قاری رہی پھر مجھے خط لکھنے کے لیے قلم اور کاغذ اٹھانا ہی پڑا۔ یہ رسالہ بچوں میں بہت مقبول ہے۔ میری دوست ماہ نور بھی بہت شوق سے پڑھتی ہے۔ میرا خط ضرور شائع کریں۔ اگر شائع نہ کریں گے تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔ (حفصہ عبیر، ساہی وال)

میں تعلیم و تربیت ایک سال سے پڑھ رہی ہوں اور بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ میری اس دل چسپی کی وجہ سے میری دوست بھی اب تعلیم و تربیت پڑھتی ہیں۔ مجھے کہانی لکھنے کا بہت شوق ہے اور میں چاہتی ہوں کہ میرے پسندیدہ رسالے میں میری کہانی شائع ہو۔ کیا میں آپ کو کہانی بھیج سکتی ہوں؟ کیا آپ میری کہانی شائع کریں گے؟ میں آپ کو پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ پلیز آپ میرا خط ضرور شائع کیجیے گا، ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ (بشریٰ رانا، پٹیالہ دوست محمد)

☆ **آپ کے خلوص اور پیار کا شکریہ! کہانیاں بھیجیں، معیاری کہانیاں ضرور شائع کریں گے۔**

ساری کہانیاں اچھی تھیں۔ نظم ٹوٹ بٹوٹ نے بین بجائی، بہت اچھی لگی۔ میں تین ماہ سے خط لکھ رہی ہوں، شامل نہیں ہوا۔ میرے امتحان ہو رہے ہیں، دُعا کیجیے گا۔ ذائقہ کارنر پڑھ کر منہ میں پانی آ گیا۔ مجھے ہر مہینے رسالہ بہت لیٹ ملتا ہے کبھی تو 10 تاریخ گزر جاتی ہے تو ملتا ہے۔ "کھیل دس منٹ کا" جیسے اور گیمز بھی شامل کریں۔ کوئی اسلامی واقعات کا سلسلہ بھی رکھیں۔ (رشدہ عدنان، کراچی)

☆ **آپ کی تجویز و آراء کا بہت شکریہ!**

کچھ دوستوں نے رسالہ تاخیر سے ملنے کی شکایت کی ہے۔ ان شاء اللہ ان شکایات کا ازالہ کیا جائے گا اور رسالے کی بروقت فراہمی کو یقینی بنائیں گے۔

خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیقؓ

سیدنا ابوبکر صدیقؓ عام الفیل کے اڑھائی سال اور حضرت محمدؐ کی ولادت کے دو سال اور چند ماہ بعد پیدا ہوئے۔ آپ کی جائے پرورش مکہ مکرمہ ہے۔ آپؓ کی والدہ کہتی ہیں: جب یہ پیدا ہوا تو غیب سے آواز آئی تھی کہ اے اللہ کی سچی بندی! تجھے خوش خبری ہو۔ یہ بچہ عتیق (آزاد) ہے۔ آسمانوں میں اس کا نام صدیقؓ ہے۔ محمدؐ کا صاحب اور رفیق ہے۔ یہ روایت خود حضرت صدیق اکبرؓ نے مجلسِ اقدسؐ میں بیان فرمائی۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد تمام عالم سے افضل حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ آپؓ نے حضرت محمدؐ کی قیادت میں تمام غزوات میں شرکت کی اور مسلمان ہونے کا حق ادا کیا۔ آپؓ کی حیات مبارکہ دینِ مصطفیٰ کے فروغ اور نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے عملی نفاذ کے لیے جدوجہد کرتے گزری۔

سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت مسلمانوں کے اجماع سے ہوئی۔ خلافت کے بعد انہوں نے پہلا خطبہ ارشاد فرمایا: ''میں تم پر حاکم بنا کر بھیجا گیا ہوں، لیکن تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں نیکی کی راہ پر چلوں تو میری فرماں برداری کرنا، لیکن اگر میرا قدم نیکی کی راہ سے ڈگمگا جائے تو مجھے درست کر دینا۔ اگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا رہوں تو میری اطاعت کرتے رہنا۔ اگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر فرض نہیں۔''

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں مالی انتظام کے لیے بیت المال اور فوجی نظام قائم کیا۔ ذمیوں کے حقوق کی نگہداشت کی تاکید فرمائی اور عملی نفاذ بھی کیا۔ عہدِ صدیقی کا ایک کارنامہ قرآن مجید کی تدوین ہے۔ اس کا باعث یہ ہوا کہ عہدِ صدیقی کی لڑائیوں میں خصوصاً جنگِ یمامہ میں حفاظِ قرآن کی بڑی تعداد شہید ہو گئی تھی۔ اس وقت حضرت عمرؓ کو اندیشہ ہوا کہ اگر حفاظِ قرآن کی شہادت کا سلسلہ قائم رہا تو قرآن کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ لہٰذا حضرت ابوبکرؓ نے مختلف لکھے ہوئے اجزاء اور حفاظِ قرآن کے سینوں سے قرآن کی سورتوں کو جمع کر کے مدون کیا۔

حضرت ابوبکرؓ سب سے زیادہ اسرارِ شریعت کے محرم اور روحِ اسلامی کے دانائے راز تھے۔ قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ و جملہ اسلامی علوم میں آپ کا پایہ نہایت بلند تھا۔ ذاتی حیثیت سے بڑے رقیق القلب، نرم خو، متواضع اور خاک سار اور زہد، تقویٰ کا مجسم پیکر تھے۔ خلافت سے پہلے تجارت کرتے تھے۔ تواضع اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ محلہ والوں تک کا کام اپنے ہاتھوں سے کر دیا کرتے تھے۔ پڑوسیوں کے مویشی چراتے، ان کا دودھ دوہ دیتے۔ خلافت ملنے کے بعد ایک لڑکی کو جس کی بکری کا دودھ دوہ دیا کرتے تھے، بڑی فکر ہوئی۔ آپؓ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ ''خلافت مجھ کو خلقِ خدا کی خدمت سے باز نہیں رکھ سکتی۔''

دو سال اور چند ماہ کی مختصر خلافت کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ 22 جمادی الثانی، 13 ہجری (22 اگست 634ء) کو پیر کے دن مغرب اور عشاء کے درمیان انتقال فرما گئے۔ اس وقت آپ کی عمر 63 سال تھی اور آپؓ کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

''اے اللہ! میری موت اسلام پر ہو اور مجھے نیکو کاروں سے ملانا۔''

☆☆☆

بہاول پور ملک کا بارھواں بڑا شہر ہے۔ یہ ماضی میں ریاست بہاول پور کا دارالحکومت تھا۔ اسے نوابوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں کئی سو برس پرانے محلات ہیں۔ ان میں دربار محل، گلزار محل اور نور محل نمایاں ہیں۔ ان میں نور محل خوب صورتی و دلکشی میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔

نور محل......نواب صادق محمد خاں عباسی نے اپنی بیگم ملکہ نور کے لیے تعمیر کروایا تھا۔ اس دل کش محل کی تعمیر کا آغاز 1872ء میں ہوا۔ تین سال کے قلیل عرصے میں اس عظیم الشان محل کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس عمدہ شاہ کار کا نقشہ ایک انگریز انجینئر مسٹر خیان نے بنایا تھا۔ اس وقت بہت سے انگریز بھی ریاست بہاول پور کے مختلف شعبوں میں کام کر رہے تھے۔ یہ انگریز اس وقت بہاول پور کا اسسٹنٹ انجینئر تھا۔

اس محل کی بنیادوں میں چاندی، تانبا اور کچھ ایسے سکے رکھے گئے ہیں جنھیں نیک شگون قرار دیا جاتا ہے۔ دھاتوں کے علاوہ اس کی بنیادوں میں ریاست کے نقشے بھی رکھے گئے ہیں۔ ایسا کرنا اس دور کی اہم روایات میں سے ایک تھا۔

نور محل، اسلامی اور اٹالین طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ انتہائی دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی تعمیر میں سیمنٹ اور لوہے کا استعمال نہیں کیا گیا بلکہ اس میں سرخ اینٹ، دال ماش، چاول، پٹ سن، چونا اور چکنی مٹی کا خاص تناسب سے استعمال ہوا ہے۔ یہ سب کچھ اس وقت کے اہم تعمیراتی اجزاء تھے۔ محل کی چھتوں پر مضبوطی کے لیے ڈاٹ کا استعمال کیا گیا ہے۔ جہاں چھت پر ڈاٹ ممکن نہ تھی، وہاں ساگوان کے تختے اور شہتیر ڈالے گئے۔ انہیں اندرونی اطراف سے مزید خوب صورتی دینے کے لیے نقش ونگار سے آراستہ کیا گیا جب کہ فرش پر 21 پتیوں پر مشتمل دس مربع انچ کے پھول دیکھنے میں بہت بھلے لگتے ہیں۔

نور محل کے اندرونی دروازے سے اندر داخل ہوں تو سامنے ایک بڑے ہال پر نظر پڑتی ہے۔ یہیں نواب صاحب کا دربار سجتا تھا۔ نواب صاحب کا تخت چاندی کا جب کہ کرسیاں سونے کی بنی ہوئی تھیں۔ محل کے دروازوں، سیڑھیوں اور دیگر مقاصد کے لیے جو لکڑی استعمال ہوئی، وہ ساگوان کی بنی تھی۔ محل کی خوب صورتی بڑھانے کے لیے جتنے بھی رنگ برنگے شیشوں کا استعمال ہوا، وہ سب انگلینڈ سے درآمد کیے گئے تھے جب کہ بڑے بڑے آئینے بطورِ خاص اٹلی سے منگوائے گئے تھے۔ نواب صاحب نے ملکہ کو اپنی محبت کے ثبوت کے لیے ہیمبرگ (جرمنی) سے ایک پیانو منگوا کر دیا تھا۔ 134 سالہ پرانا یہ نادر پیانو ماضی میں محل میں اپنی دھنیں بکھیرتا تھا۔ یہ آج بھی اپنی انگلیوں

کے انتظار میں ہے جو اسے چھو کر ماضی کی یادیں تازہ کر دے۔

نور محل کے نوادرات میں وہ مضبوط اور صاف ستھرا بلیئرڈ بھی ہے جو قائداعظم نے آخری نواب سر صادق محمد خاں عباسی کو تحفہ میں دی تھی۔ یہ بلیئرڈ نور محل کے ایک کمرے میں موجود ہے۔ بڑے ہال کے پہلو میں چھوٹے اور سادہ ہال ہیں۔ ان دونوں ہالز کے اطراف میں موجود کمرے محل کے باسیوں کے رہنے کے لیے تھے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ نواب صاحب اپنے سے زیادہ خیال محل میں کام کرنے والے لوگوں کا رکھتے تھے۔

محل کو گرمی کی شدت سے بچانے کے لیے تہہ خانوں میں نہر کی صورت پانی کا بندوبست کیا گیا تھا حالاں کہ ماضی میں قلعوں و محلات میں جو تہہ خانے بنائے جاتے تھے، ان کا زیادہ تر مقصد قیدیوں کو رکھنا ہوتا تھا۔ ان تہہ خانوں کو لوہے کے سریوں سے ڈھانپا گیا تھا یعنی ان کی چھت نہیں تھی۔ نہر کے دونوں دروازے باہر کی طرف کھلتے تھے۔ ہوا ایک دروازے سے اندر داخل ہو کر دوسرے سے باہر نکل جاتی تھی۔ اوپر سے کھلا ہونے کی وجہ سے ہوا پورے محل میں پھیلتی تھی۔ پانی کو چھو کر آنے والی ہوا یوں محسوس ہوتی تھی گویا ایئر کنڈیشنڈ سے آ رہی ہے۔ نہر کے کناروں پر چھوٹے چھوٹے کمرے تعمیر کیے گئے تھے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قیدیوں کے لیے مخصوص تھے۔ ان کے ساتھ ہی دربانوں کے کمرے بھی موجود تھے۔ ان تہہ خانوں کی بعض جگہوں سے سیڑھیاں اوپر محل کی طرف بھی کھلتی تھیں۔ اب یہ سیڑھیاں بند ہیں۔ اسی طرح نہر کو خشک ہوئے بھی بہت سال بیت گئے ہیں۔ سریے والی چھتوں کو بھی بند کر دیا گیا تھا۔

نور محل کا کل رقبہ 44600 مربع فٹ ہے۔ اس محل میں کل 32 کمرے، 14 تہہ خانے اور 3 ہال ہیں۔ محل کے اونچے برج اس کی خوب صورتی کو چار چاند لگاتے ہیں۔ محل کی تعمیر کے لیے 100 ایکڑ زمین کا انتخاب کیا گیا تھا۔ 138 برس قبل اس محل کی تعمیر پر 12 لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے اور اس دور کے حساب سے یہ ایک بہت بڑی رقم تھی۔ اوپر ذکر کیے گئے تمام محل نواب صادق عباسی نے تعمیر کروائے تھے۔ انہی محلات کی تعمیر اور خوب صورتی کی وجہ سے انہیں ”شاہ جہان بہاول پور“ بھی کہا جاتا ہے۔

ریاست بہاول پور کی بنیاد بہاول خان اول نے 1737ء میں رکھی تھی۔ 1956ء میں سر صادق محمد خان عباسی نے ریاست کو پاکستان میں ضم کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد یہ تمام محلات محکمۂ اوقاف کے پاس چلے گئے۔ 1971ء میں ان محلات کا کنٹرول فوج نے سنبھال لیا۔ عوام نے ان محلات پر فوج کے کنٹرول کو ناپسند کیا اور اس پر احتجاج بھی ہوا لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد عوام کو اس بات کا ادراک ہوا کہ اگر فوج ان محلات کا کنٹرول نہ سنبھالتی تو آج یہ قلعہ ڈھیر اور موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی طرح کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے ہوتے۔ یوں فوج کے کنٹرول کی وجہ سے یہ محل ہمارے تاریخی ورثے کے طور پر باقی رہے۔ یہ بات یقیناً قارئین کے لیے حیرت و دل چسپی کا باعث ہو گی کہ جس ملکہ نور کے لیے نواب صادق نے یہ محل تعمیر کروایا تھا، انہوں نے صرف ایک رات یہاں قیام کیا۔ ہوا کچھ یوں کہ اگلی صبح جب ملکہ نور، محل کے اردگرد باغات وغیرہ کا نظارہ کرنے کے لیے چھت پر گئیں تو محل کے سامنے وسیع رقبے پر پھیلے ملوک شاہ قبرستان کو دیکھ کر ان کا شاہی مزاج بگڑ گیا۔ انہوں نے اس بات کو پسند نہ فرمایا کہ یہ محل قبرستان کے قریب کیوں تعمیر کیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے مزید یہاں قیام نہ فرمایا اور نہ ہی کبھی دوبارہ محل کا رُخ کیا۔ یوں محل ان کے نام سے ہی موسوم رہ گیا۔

جب نور محل تعمیر کیا گیا اس وقت دُور دُور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ اس کے اردگرد باغات اور سرسبز میدان پھیلے نظر آتے تھے۔ ہر شخص آسانی سے نور محل کی سیر کر سکتا تھا مگر اب اس مقصد کے لیے ٹکٹ لینا پڑتا ہے۔ ٹکٹ لے کر آنے والوں کو یہاں کی تاریخ بتائی جاتی ہے اور نوابوں کے زیرِ استعمال صوفوں پر بھی بیٹھنے کی اجازت ہوتی ہے۔ یوں وہ چند لمحوں کے لیے ماضی سے بھرپور لطف اٹھا سکتے ہیں۔

اگر اب بھی نوابوں سے منسوب مختلف نوادرات کو اس محل میں محفوظ کر دیا جائے تو یہ تاریخی محل میوزیم میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ یوں نہ صرف باذوق لوگ اس قیمتی اور منفرد اثاثے کو دیکھنے کے لیے آئیں گے بلکہ سیاحت کو فروغ دینے کا باعث بھی بنیں گے۔

پاکستان کے نام ور مصور عبدالرحمٰن چغتائی 21 ستمبر 1897ء کو اندرونِ لاہور کے ایک علاقے ''چابک سواراں'' میں میاں کریم بخش چغتائی کے گھر پیدا ہوئے۔ بچپن میں ناظرہ پڑھا۔ کچھ سورتیں حفظ کیں۔ اس دوران اپنے پھوپھا میاں بخش نقاش سے نقاشی (نقش ونگار کرنے والا) اور مصوری کے سبق بھی لیے۔ مسجد کی تعلیم مکمل ہوئی تو مکتب کا رخ کیا۔ ریلوے ٹیکنیکل اسکول، لاہور سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب محمد عبدالرحمٰن کی روح میں فنِ مصوری سے محبت اپنی جگہ بنا رہی تھی جس نے انہیں آنے والے وقتوں میں لازوال شہرت عطا کی۔

آرٹ کا یہ دل دادہ اب میو اسکول آف آرٹس میں علم حاصل کرنے پہنچا۔ 1914ء میں وہاں سے ڈرائنگ کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ لاہور ہی کے ایک اسکول میں بہ طور ڈرائنگ ماسٹر کام کیا۔

محمد عبدالرحمٰن کے بزرگوں کے خاندان کے دو بھائی احمد اور حماد مغل بادشاہ شاہ جہاں کے دور میں ''میر تعمیرات'' تھے جنہوں نے لال قلعہ (دہلی)، جامع مسجد (دہلی) اور تاج محل (آگرہ) کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے دادا بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں میر تعمیرات رہے۔

عبدالرحمٰن چغتائی کے عملی سفر کا آغاز بھی حقیقت میں اس اسکول سے ہوتا ہے جہاں سے انہوں نے آرٹ کی بنیادی تعلیم حاصل کی تھی۔ 1916ء میں میو اسکول آف آرٹس کے فوٹو لیتھوگرافی کے شعبے میں شمولیت اختیار کی اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ وہ وہاں 1924ء تک رہے اور پھر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس ملازمت کے بعد انہوں نے ہمیشہ آزاد زندگی گزاری۔

1917ء میں وہ فنِ مصوری کے آفتاب بن کر ابھرے، جب ان کی بنائی ہوئی ایک تصویر کلکتہ کے مشہور انگریزی ماہنامے ''ماڈرن ریویو'' میں شائع ہوئی۔ کئی اور تصاویر بھی تواتر سے شائع ہوئیں تو انہیں وہ اعتبار ملا کہ ان کی شہرت کا ڈنکا ہندوستان سے باہر بھی بجنے لگا۔

1919ء میں پنجاب فائن آرٹ سوسائٹی کے زیرِ اہتمام لاہور میں ان کی تصاویر کی پہلی بار نمائش ہوئی، جس میں ان کے فن کے شاہ کار کو خوب سراہا گیا۔ جب انہوں نے علامہ محمد اقبال کی شاعری کو مصوری کا رنگ دیا تو ان کی شہرت اور عزت میں مزید اضافہ ہوا۔

اس سلسلے میں پہلی تصویر ماہنامہ نیرنگ خیال میں جولائی 1924ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد تو ہر شمارے میں ان کی تصویر کا شامل ہونا معمول بن گیا۔ ان تصاویر پر وضاحتی نوٹ اور مضامین ڈاکٹر دین محمد تاثیر (ایم ڈی تاثیر) جیسے صاحب علم شخصیت کے قلم سے لکھے جاتے۔

وہ مصوری کے ساتھ ساتھ افسانے بھی لکھتے رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ایک ہزار سے زیادہ تصاویر اور اتنے ہی پنسل کے نقوش تیار کیے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے آرٹ کو فروغ دینا چاہا، لیکن عبدالرحمٰن چغتائی نے مغلیہ طرز میں کمال حاصل کر کے اسے پھیلایا۔ ان کے تصاویر میں موضوعات تاریخ اسلام کے مشاہیر (مشہور کی جمع)، ہندو دیو مالا، بدھ مت کے بعض موضوعات، پنجابی کسان، کشمیری کاشت کار، بنگالی سادھو اور مدراسی دوشیزائیں رہے۔

ان کی تصاویر دُنیا کے کئی بڑے عجائب خانوں کی زینت بنیں جن میں برٹش میوزیم، دی وکٹوریا، البرٹ میوزیم (دہلی) اور نیشنل میوزیم آف ماڈرن آرٹ شامل ہیں۔ ان کی کئی تصاویر ملکہ الزبتھ دوئم کے ذاتی ذخیرے کی زینت بھی بنیں۔

ان کی تصاویر کی نمائش لندن، پیرس اور برلن کے علاوہ کئی اور ممالک میں بھی ہوئیں۔ پاکستان کی تاریخ میں فن مصوری کی پہلی نمائش 11 دسمبر 1949ء کو الحمرا، لاہور میں منعقد ہوئی تھی جو آپ ہی کی تصاویر پر مبنی تھی۔ اس کا افتتاح اس وقت کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے کیا تھا۔

عبدالرحمٰن چغتائی کی تصاویر اقوام متحدہ (نیویارک) کی عمارت کی آرائش کے لیے بھی حاصل کی گئیں۔ اسی طرح ہیگ (ہالینڈ) کے قصرِ امن کو بھی ان کی تصاویر سے مزین کیا گیا ہے۔ انہیں قدیم مصوروں اور فن کاروں کے شاہ کار جمع کرنے کا بھی شوق رہا۔ ان کے پاس ایران، مغل اور راجپوت طرز کے نامور مصوروں کے شاہ کار موجود تھے۔

1937ء میں مشہور مصور پکاسو نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ "وہ لکیروں کا خوب صورت استعمال کرتے ہیں۔" 1962ء میں ملکہ الزبتھ دوئم نے کہا: "میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ چغتائی فن پارے میرے پاس موجود ہیں۔" برطانوی راج میں انہیں "خان بہادر" کا خطاب دیا گیا۔ حکومت پاکستان نے انہیں ہلال امتیاز سے نوازا۔

قیامِ پاکستان کے بعد عبدالرحمٰن چغتائی نے نہ صرف پاکستان کے ابتدائی چار ڈاک ٹکٹوں میں سے ایک ٹکٹ ڈیزائن کیا بلکہ ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن کے مونوگرام بھی ڈیزائن کیے۔

ان کی خوب صورت تصاویر کا مجموعہ مرقع چغتائی (منتخب اشعار غالب کی مصورانہ تشریح)، نقش چغتائی (کلام غالب کی تشریح) اور عمل چغتائی (علامہ اقبال کے منتخب اشعار کا مصور نسخہ) کے علاوہ افسانوں کے مجموعے "کاجل" اور "لگان" موجود ہیں۔

17 جنوری 1975ء کو ان کا انتقال ہوا تو دُنیا کے کئی سربراہان مملکت نے انہیں شان دار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا جن میں ملکہ برطانیہ، وزیراعظم بھارت، نائب صدر امریکا، جرمنی کے صدر اور اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل شامل ہیں۔ 21 ستمبر 1997ء کو ان کی صد سالہ (سو سالہ) سال گرہ کے موقع پر لاہور میں "چغتائی میوزیم ٹرسٹ" قائم کیا گیا۔

☆☆☆

کلامِ اقبال

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی!
عطّار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!
نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی
اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسداللّٰہی!
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی!

اسرار: راز۔ سحر گاہی: صبح کے وقت کی۔ فرزانہ: عقل مند۔ کم کوش: کم کوشش کرنے والا۔ اسداللّٰہی: شیر خدا حضرت علیؓ کا لقب۔ روباہی: چال۔ طائر لاہوتی: لاہوت کا پرندہ۔ روحانیت کا بلند ترین مقام جہاں ذات باری کے انوار و تجلیات کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

بندو پہلوان شہر آ تو گئے لیکن ان کا دل گاؤں کے آبشاروں اور قل قل کرتے چشموں میں ہی اٹکا رہا۔ آبشاروں سے ان کی مراد وہ پرنالے تھے جن کے نیچے کھڑے ہو کر وہ برسات میں نہایا کرتے تھے اور چشموں سے مراد کمہاروں کے جھونپڑوں کے پیچھے واقع اس جوہڑ سے تھی جس میں بھینسیں اور گاؤں کے بچے دن بھر کیچڑ میں نہایا کرتے تھے۔ بندو اپنے دوست چندو کے پُر زور اصرار پر شہر آئے تھے لیکن ابھی تک چندو کا پتا نہ مل سکا تھا۔ چندو جب پچھلی بار گاؤں آیا اور سرخ پھولوں والی شرٹ اور چست جینز پہن کر گاؤں کی گلیوں میں اکڑتا ہوا نکلا تو گاؤں کے لڑکے اس کو حسرت اور رشک کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ اس نے بندو کو یقین دلایا تھا کہ وہ اگر شہر آجائے تو وہ اس کی مناسب نوکری کا بندوبست کر دے گا۔ حمید پٹواری سے جو چندو کا پتا لکھوا کر لائے تھے وہ نہ صرف نامکمل تھا بلکہ بدخطی کی وجہ سے اسے پڑھنا بھی محال تھا۔

بندو تین دن سے لوگوں اور ٹریفک کے اژدہام میں حواس باختہ گھوم رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہر شخص کہاں اور کیوں بھاگ رہا ہے۔ شور، ہنگامہ اور گرد و غبار سے تنگ آ کر انہوں نے سوچا کہ وہ گاؤں لوٹ جائیں اور اسی روکھی سوکھی پر گزارا کریں۔ اتفاق سے ان کی ملاقات اپنے گاؤں کے ایک لڑکے امین سے ہوگئی جو کچی آبادی کے ایک کوارٹر میں رہتا تھا اور وہیں اس نے بال کاٹنے کی دُکان کھول رکھی تھی۔ تین چار دن سے وہ امین کے ساتھ ہی رہ رہے تھے۔ ایک دن امین کی دُکان پر ایک شخص نے بندو کو اطلاع دی کہ چڑیا گھر میں چوکی دار کی آسامی خالی ہے۔ دو ہزار تنخواہ اور کھانے اور رہنے کی سہولت بھی ہے۔ اگلے دن بندو چڑیا گھر کا پتا تلاش کرتے ہوئے صبح آٹھ بجے ہی پہنچ گئے۔

دفتر کے کھلنے میں ابھی دیر تھی، اس لیے وہ اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ جب بھی وہ کسی جانور کے پنجرے کے سامنے سے گزرتے تو وہ جانوروں کو اور جانور اس کو حیرت سے دیکھتے۔ دس بجے کے قریب جب دفتر کھلا تو انہوں نے منیجر کے سامنے حاضری دی۔ منیجر نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ چوکی دار کی آسامی تو ایک دن پہلے پُر ہوگئی ہے۔ بندو بڑی امید لے کر آئے تھے اس لیے ان کو بہت مایوسی ہوئی۔ انہوں نے گڑگڑا کر اپنی مجبوری اور بے سرو سامانی کی رُوداد سنائی لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ جب بہت خوشامد کے بعد بھی بات نہ بنی تو بندو گلے میں جھولتی پگڑی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے واپسی کے لیے مُڑے۔ منیجر کو ان کی حالت زار دیکھ کر رحم آ گیا اور ان کو واپس بلا

کر لیں۔ بندو سر جھکائے آہستہ سے گڑگڑائے۔

''جنگل کے بادشاہ! میری زندگی بخش دے۔ میں ایک غریب پردیسی انسان ہوں۔ مجھے چڑیا گھر والوں نے تین ہزار ماہانہ پر ریچھ کی کھال پہن کر بیٹھنے کے لیے رکھا ہے۔'' شیر نے ان کے قریب آ کر کان میں کہا۔

''بھائی! میں بھی پردیسی ہوں مجھے چڑیا گھر والوں نے چار ہزار ماہانہ پر رکھا ہے۔''

پہلے تو بندو کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، پھر انہیں آواز کچھ جانی پہچانی سی لگی اور پھر وہ کچھ یاد کر کے شیر سے لپٹ کر آہستہ سے بولے۔ ''یار! چندو تو؟''

یہ سن کر شیر خوشی سے بولا۔ ''اوئے! بندو تو؟''

جب بھیڑ کم ہو گئی تو چندو نے بندو کے کان میں کہا۔

''یار بندو! تجھے ایک راز کی بات بتا رہا ہوں۔ اس چڑیا گھر میں زیادہ تر بے روزگار نوجوان ہی جانوروں کی کھالیں پہنے بیٹھے ہیں۔ دو تین تو اپنے گاؤں کے ہی ہیں۔ یہ صاحب جو لنگور کی کھال پہنے درخت سے لٹک رہے ہیں، گریجوایٹ ہیں۔ وہ چیتے صاحب جو چھپ کر سگریٹ پی رہے ہیں، میٹرک میں دو بار فیل ہو کر اس مقام پر پہنچے ہیں۔ چڑیا گھر بند ہونے کے بعد ہم سب کی محفل رات گئے تک جمتی ہے، تم بالکل بور نہیں ہو گے۔''

لوگ شیر اور ریچھ کو اس طرح کھسر پھسر کرتا دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔

بانو کی بلی

نگہت خالد جمیل

بانو نے اک بلی پالی
آدھی گوری آدھی کالی
بھوری بھوری آنکھوں والی
ریشم جیسے بالوں والی
چڑیا چوزے شوق سے کھائے
دودھ پیئے اور سو جائے
پنجے بھی دکھلاتی ہے
کتے سے ڈر جاتی ہے
بنتی اور سنورتی ہے
چوہوں پہ وہ مرتی ہے

کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''دیکھو میاں بندو! ایک صورت ہو سکتی ہے۔ تنخواہ بھی تین ہزار ہوگی اور کام بھی بہت آسان ہے۔''

بندو کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے بغیر تفصیل سنے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ منیجر نے گلا صاف کرتے ہوئے تفصیل بتائی۔

''دیکھو میاں بندو! ایسا ہے کہ ہمارے چڑیا گھر کا سب سے ہر دل عزیز جانور ریچھ تھا، جس کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ جب وہ قلابازیاں کھا کر بچوں کو رجھاتا تھا تو بچے اس کو بہت پسند کرتے تھے۔ چڑیا گھر دس بجے کھلتا ہے لیکن رش شام چار بجے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ تمہیں یہ کرنا ہوگا کہ چار گھنٹے کے لیے ریچھ کی کھال پہن کر پنجرے میں بیٹھنا ہوگا اور بچوں کو خوش کرنا ہوگا۔'' پہلے تو بندو یہ سن کر پریشان ہوئے لیکن وہ بے کاری سے اتنا اُکتا گئے تھے کہ کچھ پس و پیش کے بعد ہامی بھر لی۔

اگلے دن بندو میاں ریچھ کی کھال پہن کر پنجرے میں بیٹھ گئے۔

ریچھ سے ملحق شیر کا پنجرہ تھا۔ بندو نے محسوس کیا کہ شیر ان کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کو خدشہ ہوا کہ کہیں انسان کی بو سونگھ کر شیر نے اس کو پہچان تو نہیں لیا۔ سورج کے چڑھتے چڑھتے بندو کی حالت غیر ہونا شروع ہو گئی۔ جب وہ گرمی کی وجہ سے اپنی بغلوں اور گردن کو اچھل اچھل کر کھجاتے تو اس کی حرکتوں کو دیکھ کر پنجرے کی جالیوں سے چہرے لگائے بچے بہت خوش ہوتے۔ جانوروں کے محافظ کے اشارے پر اس نے ایک دو قلابازیاں بھی کھانے کی کوشش کی۔ وہ دعا مانگ رہے تھے کہ جلدی سورج ڈھلے تو اس کو سکون ملے۔

دوپہر کو جب چڑیا گھر کا محافظ جانوروں کو کھانا دینے آیا تو وہ شیر اور ریچھ کے پنجروں کے درمیان واقع گرل کا دروازہ بند کرنا بھول گیا۔ بندو نے بھی اپنی پریشانی میں اس طرف دھیان نہیں دیا۔ شام کو جب چاروں طرف بچوں کا ہجوم تھا تو شیر خراماں خراماں ٹہلتا ہوا بندو کے پنجرے میں آ گیا۔ بندو نے جو پلٹ کر شیر کو اپنے اتنے قریب دیکھا تو ان کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگے۔ پنجرے کی جالیوں کے باہر کھڑے بچے یہ منظر دیکھ کر بہت لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ریچھ کے پنجرے کے گرد لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ جب بندو نے شیر کی سانسیں اپنے کاندھے پر محسوس کیں تو موت کو اپنے اتنے نزدیک دیکھ کر انہوں نے خوف سے آنکھیں بند

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10/ جون 2014ء ہے۔

مئی 2014ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- سپائیڈر مین نے جالا چپکایا، عورت نے جالے سے فائدہ اٹھایا۔ (محمد مجیر خان، بھکر)
- سپائیڈر مین کھڑا ہے جالا تانے، امی کو ہیں کپڑے سکھانے۔ (محمد شعیب انور، واہ کینٹ)
- سپائیڈر مین سے لیا ہے کام، کپڑے سکھانے ہو گئے آسان۔ (محمد اویس، فیصل آباد)
- سپائیڈر مین نے بنائی جالے کی تار، لڑکی نے لگا دی کپڑوں کی قطار۔ (محمد شاہد جمعہ، لاہور)
- حکم کریں سرکار، کام کے لیے ہوں تیار۔ (عابد رحمان، لاہور)

ہونہار مصور

کرکٹ میچ

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

ماریہ سہیل، اٹک (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

شیزہ جاوید، گوجرانوالہ (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)
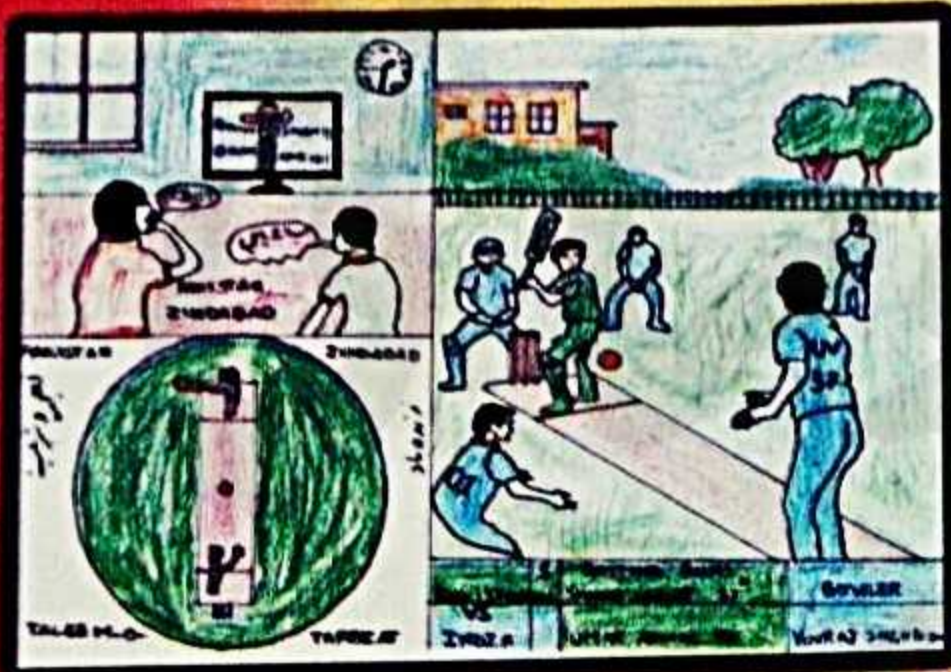
علی زیب خالد، گجرات (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

زبیر جمشید، خانیوال (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

کشف طاہر، لاہور (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام یہ ذریعہ قرعہ اندازی: حنیفہ طاہر، گجرات۔ حیدر زاہد شیخ، گوجرانوالہ۔ محمد زین عظمت، گوجرانوالہ۔ طلحہ محمود، سرگودھا۔ سمیر یعقوب، منظور کالونی۔ مریم عمر، راول پنڈی۔ محمد زبیر مقصود، لاہور۔ احمد ایاز خان برکی، لاہور۔ صفا رشید، کراچی۔ محمد جمیل، کراچی۔ عذرا بانو، جھنگ۔ محمد سرمد، شیخوپورہ۔ بلیغ الرحمٰن، پشاور۔ آصفہ ممتاز، ڈی آئی خان۔ شہزاد صالح، کوہاٹ۔ عبدالغنی قریشی، سرگودھا۔ محمد عبداللہ، گوجرانوالہ۔ محمد فاروق، ہری پور، ہزارہ۔ ریاض محمود، حیدر آباد۔ خواجہ اعجاز احمد، خانیوال۔ زرینہ جبین، لاہور۔ شجاع افضل، ملتان۔ آمنہ سلطان، کراچی۔ سید اشفاق الحق، فیصل آباد۔ خالد گل، کوہاٹ۔ مسعود اقبال، گجرات۔ عابد حسین شاہ، سیال کوٹ۔ انور انجم، وزیر آباد۔ بتول فاطمہ، حیدر آباد۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

جون کا موضوع
چڑیا گھر
آخری تاریخ 8 جون

آخری تاریخ 8 جولائی